خسرو کا ذہنی سفر

ظ انصاری

خسرو کا ذہنی سفر

خسرو کا ذہنی سفر

ظ۔ انصاری

انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو گھر، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو (ہند) ۵۲۸

پہلا اڈیشن	:	۱۹۷۷ء
دوسرا اڈیشن	:	۱۹۸۸ء
قیمت	:	پچیس ۲۵ روپے
طباعت	:	سمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دِلّی
بہ اہتمام	:	انیس احمد

— پتے —

انجمن ترقی اُردو (ہند)
اُردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دِلّی

انجمن ترقی اُردو بکڈپو
سلطان جہاں منزل
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ (یوپی)

انتساب

کرم فرما شری شنکر دیال شرما
کے نام
جنھیں زندگی اور فن کی وہی قدریں عزیز ہیں جو
خسرو شناسی
اور ہند شناسی
میں مشترک ہیں

ترتیب

اس مقالے پر

خسرو شناسی کے یہ ورق ستمبر ۷۵ء کے دوران پونہ میں لکھے گئے تھے۔ ہفتہ بھر کو گورنر مہاراشٹر علی یاور جنگ بہادر کا میں مہمان تھا۔ یہ خیال کر کے انہی کو امیر خسرو پر انگریزی اور اُردو کی یادگاری جلدوں کا دیباچہ ہونا ہے، میں نے حیاتِ خسرو کے اہم واقعات اور اُن سے اُبھرنے والے ذہنی اور فنی نتیجوں پر نظر رکھی، اُن پہلوؤں کی طرف صرف اشارہ کر کے گزر گیا جن پہ دوسرے اہلِ قلم نے تفصیل سے سوچا اور لکھا تھا — اور وہ دونوں کتابوں میں شامل تھا۔

لکھت تمام ہوئی تو پتہ چلا کہ صفحات زیادہ پھیل گئے ہیں، اُنہیں اور سمیٹنا ہوگا۔ سمیٹا۔ مگر تب تک اُردو، انگریزی دونوں جلدیں تیار ہو چکی تھیں۔ اُردو جلد (خسرو شناسی) ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی (نمبر ۲۲) نے چھاپی۔ میں بمبئی میں تھا، وہاں وقتِ ضرورت اصل مقالہ (کہ یہاں تیسرے سے ساتویں باب تک موجود ہے) جابجا کتر دیا گیا اور وہ بے ربط ہو گیا۔ انگریزی میں وہ اور تباہ ہوا۔ صدر کمیٹی نواب صاحب مذکور نے اس کی ناقص انگریزی کو کامل بنانے کے لئے

اوّل تو دیدہ ریزی کی پھر سنگ آکر روک لیا تاکہ پھر سے لکھا جائے۔ اتنے دنوں (مقررہ میعاد) اتنے صفحوں (مقرّرہ مقدار) میں اور اتنی خوبیوں (مقرّرہ معیار) کے ساتھ لکھا جائے کہ وہ اڈیٹر (یعنی خاکسار) اس جرأت کی اجازت دے دیں۔

بعض اہلِ علم بھی لکھنے کا کام کس قدر آسان سمجھتے ہیں! یہاں تو معمولی سی اُردو لکھتے وقت پتہ پانی ہوتا ہے:

بینی اَم گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل

اپنی اپنی بساط کی بات ہے۔ میں تو ہار گیا۔ بالآخر انگریزی جلد کے دیباچے کے لئے دوسرا مختصر سا مضمون لکھا اور تری انگریزی کے باوجود اسے شروع میں شامل کیا۔ (پہلا، دوسرا اور آٹھواں باب وہی ہے) حوالے اور حاشئے، جو اُردو، انگریزی دونوں کتابوں میں رہ گئے تھے، بڑھائے اور برادرِ عزیز خلیق انجم صاحب (جو انجم کے بجائے سراپا انجمن ہو چکے ہیں) خم ٹھونک کر اس کی اشاعت پر اُتر آئے۔ کہا کتاب سَو صفحے کی ہو۔ مقالے سے جو ورق بچیں اُن میں کلامِ خسرو (انتخاب) معہ ترجمہ دے دیا جائے۔ یوں تو کتابت کے دَوران کچھ ورق کھوئے گئے۔ وہ پھر سے بھرے۔

خلا فطرت کو ناگوار ہے اور یہاں اس مقالے میں کہیں کہیں خلا رہ گیا ہے۔ مجبوری!

کہنے کا مقصد یہ کہ دراصل یہ ایک پُورا مقالہ ہے۔ یہاں امیر خسرو کی زندگی اور اُن کے کلام پر کہیں دھیمی اور کہیں اتنی تیز روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں خسرو کے قد و قامت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنا دشوار نہ ہو۔ میں کوئی چھ سال سے خسرو کے مطالعے میں مصروف ہوں۔ سات مضمون لکھے ہیں۔ آٹھ کتابیں ایڈٹ کی ہیں اور ابھی اپنے قابل کچھ کام باقی ہیں۔ مثلاً خسرو کی نظم و نثر، الفاظ و اصطلاحات، محاورات و استعارات کا ایک ادبی لُغت —— جو پُورا وقت اور جی جان سے محنت چاہتا ہے۔

فی الحال جو یہ نذرانہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے قبول کرنے والوں سے درخواست ہے کہ اصل عبارت (متن) کے ساتھ ساتھ حوالے اور حاشئے بھی دیکھ لیں تاکہ لکھنے والے کو اپنے کئے کی جزا یا سزا مل سکے۔ والسلام

ظ۔ انصاری

۲۹۔ فروری ۱۹۷۶، بمبئی (۵)

دیباچہ [دوسرے ایڈیشن کا]

حسّاس ہستیوں کا سفر عمر بھر جاری رہتا ہے۔ جسم اور ذہن اکثر اس سفر میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ نشیب و فراز سے گزرتے ہیں، اگلے مرحلوں کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ اگر کسی مجبوری سے ان کا ساتھ چھوٹ جائے، کوئی جی نی یس (GENIUS) ایک ٹھکانے پاؤں گاڑ کر بیٹھ رہے تو وہ مشاہدۂ خلق اور مشاہدۂ نفس سے اُس کی تلافی کرلیتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین کو یہ دوسری صورتِ حال پیش آئی اور ان کے پرستار امیر خسرو کو پہلی حالت۔

امیر خسرو ۷۲ برس جیے، عمر بھر حرکت میں رہے۔ ہندستان کے چاروں کھونٹ گھومے، پھرے، زمینوں اور زبانوں کی سیر کی، اُن کے ضمیر میں اترے۔ سامنے کے منظر کی چادر سر کا کر اپنے زمانے کی تہ و بالا حقیقتوں کو چھوکر، برت کر دیکھا۔ اپنی نظم و نثر میں ہمیں دکھایا۔ جو دکھایا وہ آج سات صدی پار بھی پرانا یا از کار رفتہ نہیں ہوا۔ اسی سے ہمارا رشتہ کہیں اتنا دھندلا ہے اور کہیں کھلا کھلا جتنا اپنے آبا و اجداد سے، اُن کے آبا و اجداد سے: گنگا اور ہمالیہ سے۔ ماہ و سال نے تقویم پلٹی، کیلنڈر بدلے، معاملات اور واقعات کی سطح بدلی، اصطلاحیں بدلیں، استعارے بدلے، ادارے بدلے — لیکن ارادے نہیں بدلے گئے۔ ارادوں کو یکسر بدل ڈالنے کا سلسلۂ عمل، جیسے تیسے، چل تو رہا ہے، تاہم تہذیبِ حاضر کے بس میں نہیں اس کی تکمیل: تلاطم اور

تصادم میں، نت نئی آگاہی کی رفتار کے ساتھ تیزی ہی آئی ہے، کمی نہیں آئی۔

یوں دیکھیے تو امیر خسرو کے جسمانی اور ذہنی سفر کی داستان، ان کے ہاں ردّ و قبول کا عمل، اِختیار اور انکار کا مطالعہ ہمارے لیے اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے ان کی تحریریں شعری اور نثری اَدبیات کے علاوہ، سماجی اُتھل پُتھل سیاسی عروج و زوال، تہذیبی آداب و اطوار، گویا تاریخ کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہنچاتی ہیں اور ہمارے تاریخی شعور پر سان رکھنے کے کام آتی ہیں۔

مجھے پورے پانچ برس امیر خسرو کے مطالعے کے لیے میسّر آئے (۵ - - ۱۹۷۰ء) اُن کی صرف ایک تصنیف ہے پانچ حصوں میں [رسائل الاعجاز یا اعجازِ خسروی] جسے تیرھویں صدی عیسوی کے آخر اور چودھویں کے شروع چوتھائی کی انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہیے کہ وہ نہ پوری پڑھ سکا، نہ پوری طرح سمجھ سکا۔ زندہ خسرو شناسوں میں بمشکل تین چار اہلِ علم ہوں گے جو "رسائل" کو اوّل تا آخر پڑھ اور سمجھ سکے ہیں۔ البتہ اتنا ہوا کہ اس کی روشنی میں امیر کے کلام کی تہ داری اور معنویت کھلتی گئی۔ کچھ رموز آشکار ہوئے۔

اس عظیم الشان تصنیف کی روشنی میں ایک نکتہ جو سیرت اور کلام سے اُبھرا وہ یہ کہ کلیدی یا مرکزی لفظ امیر کا "عشق" ہے۔ انھوں نے ہر طرح کے عشق کیے ہوں گے، لیکن وہ عشق جو خواجہ نظام الدین، ان کی سیرت اور بیوہار یا مجموعۂ اقدار سے کیا، اٹل رہا، عمر بھر رہا —— پہلودار زندگی کو دیکھنے، برتنے اور اپنانے میں اسی عشق کی کارفرمائی ہے۔ اسی عشق نے اُن پر ترک و اختیار کا مرحلہ آسان کیا۔ دوست دشمن کا اصل امتیاز سکھایا کہ نہ کوئی فریق اَزلی و اَبدی دوست ہے، نہ دشمن۔ انسانی رشتے، نیتیں اور ہُنر ہیں جن سے اپناپن یا غیریت برتنے میں خلقِ خدا کی فلاح کی راہ کھلتی ہے کہ وہی مذہب کا منشا بھی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ کہ انھوں نے "وحدتِ اَدیان" کا راز پالیا تھا۔ رسوم کے اختلاف کو وہ ظاہر کی رنگا رنگی سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ریت رواج اور نیتی یا پالیسی اَدلتے بدلتے رنگ ہیں حقیقت کھال پر نہیں رنگتی، کھال کے اندر نہاں اور رواں رہتی ہے خسرو فاتح فوجوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ فاتح اور جلاد بادشاہوں کے جلو میں چلتے ہیں۔ انعام و اکرام کی توقع رکھتے ہیں،

لیکن مفتوحین سے اُن کی ہمدردی ہیں اور مفتوحین کے فن و ہنر کی قدردانی میں فرق یا فتور نہیں آتا۔ تاج و تخت کے وارثوں اور غاصبوں کی فرمائش پر نثر و نظم لکھتے ہیں لیکن اُتھلی کو دبی زبان سے، کہیں دوٹوک، کہیں گھما پھرا کر نصیحتیں کرتے جاتے ہیں۔ عدل اور احسان کی افضلیت جتاتے ہیں اور احسان ناشناسی کی حد تک دل کی بات زبان پر لاتے ہیں۔ قصیدے میں ہجو ملیح کی اور شکر میں شکایت کی ترشی ملا دیتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو امیر کا یہ تہ دار رویّہ خود ہمارے زمانے کے اُن اہلِ علم اور اہلِ قلم کے لیے سبق بلکہ ایک تازیانہ ہے جو کسی نہ کسی قوتِ فرماں روا یا نظریاتی فارمولے سے مکمل وابستگی کو حقیقت پسندی کی ترجمانی سمجھ کر بزعمِ خود عصری حسیت اور سماجی آگہی کے علَم بردار ہیں۔ امیر کے ہنر اور دیدہ وری سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی اختیار بعض عصری سہولتوں کو ترک کیے بغیر نہیں پنپتا۔ امیر نے دنیا کمائی بھی خوب، اور لُٹائی بھی دھڑلّے سے۔ [لُٹانے اور بھرپور جینے کے لیے ہی کمائی تھی] اولاد کو جو وصیتیں کی ہیں (ملاحظہ ہو اندر کے صفحات میں حاشیے حوالے) ان میں تاسّف اتنا نہیں جتنا بھرپور جیون بتانے کے گر بتائے گئے ہیں۔ انھوں نے ترک و اختیار کے انتخاب میں کمال دکھایا ہے۔

ایک اور نکتہ ـــــ جو اوّل غالب کی نثر و نظم سے اور پھر امیر خسرو کی تصانیف سے روشن ہوا [اور جس کے آگے میں نے آنکھیں بچھائیں] تحریر میں موسیقی کی روح یا آوازوں کے آہنگ، زیر و بم۔ اور صوتی خوشگواری ہے۔ شاعری میں تو خیر، قافیے ردیف اور بحر کی بدولت یوں بھی آہنگ کِھل اُٹھتا ہے لیکن نثر میں آوازوں کے باہمی ربط "ردم" پر نظر رہنا، خیال، بیان اور منطقی تسلسل کو مقدم مان کر پس منظر کی ہلکی موسیقی برقرار رکھنا زیادہ گہرا اور پاٹ دار فن ہے جو نثری الفاظ کی ادائگی کو سپاٹ ہونے سے بچالیتا ہے۔ فارسی کے بہترین نثر نگاروں کو (شیخ سعدی کے پیش رو عبداللہ الانصاری سے لے کر صدیوں تک) فرنچ اور انگریزی کے انشاپردازوں سے بہت پہلے یہ گر معلوم تھا اور اس کے برتنے والوں میں ہمارے امیر خسرو نمایاں ہیں۔ موسیقی میں اُن کی مہارت اور فنکاری کی چاشنی نثر و نظم میں بھی

رچی بسی ہے۔ ہم جیسوں کو، جنھیں یہ انمول ورثہ نصیب ہوا ہے، اِسے اپنے زمانے کے سائنسی سوچ کے بَل پر اظہار کے سانچے میں سمونا چاہیے۔

"خسرو کا ذہنی سفر"

دراصل چند صفحات کا ایک مقالہ ہے جو ستمبر ۱۹۷۵ء میں گورنر ہاؤس پونہ کے دورانِ قیام لکھے گئے تھے، اِس نیت سے کہ انھیں اپنی مرتب کی ہوئی کتاب "خسرو شناسی" کا پیش لفظ بناؤں گا۔ کم و بیش وہی مضامین انگریزی کی TIME LIFE & WORKS OF AMEER KHUSRAU یادگار جلد میں شامل تھے۔ اُردو میں ان کا خلاصہ دے دیا تھا۔ دونوں مُرتبہ اور زیرِ طبع کتابوں پر جدا جدا دیباچے لکھنے تھے۔ کتاب چھپنے کے آخری مَراحل میں تھی، راشٹرپتی بھون میں اس کی منھ دکھائی کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا کہ "نیشنل امیر خسرو سوسائٹی" کے صدر اور اس مہم کے روحِ رَواں نواب علی یاور جنگ (مرحوم) نے پونہ بلا کر اپنا مہمان بنا کر مجھے اس مقالے میں محدود کر دیا اور قبل اس کے کہ یہ ورق پریس پہنچیں، خود ایک عالی شان عالمانہ دیباچہ لکھ کر اُردو اور انگریزی کی دونوں جلدوں کے لیے بھیج دیا۔ ان کے شامل کتاب ہونے کے بعد اڈیٹر کی طرف سے مکمل تعارفی مقالے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ آخر کاٹ پیٹ کر وہ جوں توں یہاں اور وہاں کھپائے گئے۔ اور اصل متن کی اشاعت کا ذمّہ برادرِ عزیز پروفیسر خلیق انجم نے لیا (جو سراپا انجمن ہو چکے ہیں) وہ توجہ نہ کرتے تو یہ مسودہ کہیں کاغذوں کے انبار میں پڑا رہ جاتا مگر ان کا کہنا تھا کہ کتاب سَو صفحے سے آگے نہ پھیلے اور اس میں کلامِ خسرو کے چند نمونے مع ترجمہ بھی آجائیں کہ عام پڑھنے والا فیضیاب ہو سکے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ:

دراصل یہ ایک پورا مقالہ ہے۔ یہاں امیر خسرو کی زندگی اور اُن کے کلام پر کم سے کم لفظوں میں کہیں دھیمی اور کہیں اتنی تیز روشنی ڈالی گئی ہے جس میں خسرو کے قد و قامت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ انگریزی کے (محولہ بالا) مجلّد میں مختلف ملکوں اور فکری حلقوں کے اُنتیس[۲۹] اہلِ علم نے خاص اِسی مجموعۂ مضامین کے لیے داد دیا ہے۔ اُردو میں ان کا خلاصہ "خسرو شناسی"

کے نام سے "ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے چھاپا۔ حکومتِ ہند نے ایک انتھالوجی اور رنگین بروشر نکالے۔

۷۶-۱۹۷۵ء میں ہندوستان میں امیر کی ہفت صد سالہ تقریبات منائی گئیں، رسالوں نے خاص نمبر شائع کیے۔ اشاعت گھروں نے کتابچے اور کتاب مضامین کے مجموعے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس سے پیشتر اور امیر کے بعد ٹھیک چھ سو سال کے دوران اگر کوئی مفصل اور وقیع علمی کام منظر عام پر آیا تھا تو وہ ڈاکٹر وحید مرزا کا [پہلے انگریزی اور پھر اردو میں] پی ایچ ڈی کا تھیسس۔ یہ گویا علی گڑھ یونیورسٹی سے شائع ہونے والے سلسلۂ تصانیفِ خسرو کا نقطۂ عروج تھا ــــــ اور پھر سناٹا ہو گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے ساتویں دہے اور ۱۹۸۰ء کے دوران مختلف زبانوں اور ملکوں میں خسرو کے تعلق سے سلسلۂ تصانیف و تالیفات کی تعداد پچاس کے قریب پہنچ گئی۔ "مارگ" رسالے نے اور ہم (یعنی نیشنل امیر خسرو سوسائٹی) نے تصاویر کے البم نکالے، ڈاکومنٹری فلم بنوائی، موسیقی کے ریکارڈ اور کیسٹ، بیلے، ڈرامے، متفرق مضامین شائع کیے اور لکھوائے۔ ببلیوگرافی (کتابیات) کی ایک جلد تیار کی۔ ہفت صد سالہ تقریبات کی مہم (جس کا حوالہ آگے آئے گا) ملکوں ملکوں پھیلنے سے کئی قیمتی تصانیف کی ولادت ہوئی۔ ان میں ہماری سوسائٹی کی چند قابلِ قدر کوششوں کے علاوہ پروفیسر ممتاز حسین (کراچی) کی وزنی اُردو تصنیف بھی ہے جس نے پہلی بار کئی مُسلّمات کو چیلنج کیا۔ مثلاً:

امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین [شمسی] تھا اور ترکی نام لاچین۔

نانا کا اصل نام گھنتیام اور عماد الملک خطاب۔

وطن دہلی تھا نہ کہ پٹیالی، مومن آباد ضلع اٹیہ۔

خواجہ نظام سے پیری مریدی کے نہیں، ہمدمی اور ہم نفسی کے مراسم تھے۔

خواجہ کے انتقال کے بعد بھی امیر نے محمد تغلق کے دربار میں قصیدہ گزرانا۔

شکاگو کے پروفیسر فضل الرحمن نے ایک علمی مقالے میں ثابت کیا کہ خواجہ کی درگاہ میں جو سماع ہوتا تھا اس میں امیر خسرو کے لیے کچھ حدود مقرر تھیں۔ ـــــ بروس لارنس نے تحقیق پیش کی کہ "افضل الفوائد" (ملفوظاتِ خواجہ) امیر کی تصنیف نہیں۔ دہلی کے استاد موسیقار چاند خاں

نے خسرو اور موسیقی کے دہلوی گھرانے کی خدمات پر نہایت قابل قدر تصنیف تیار کی۔
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جرمنی کے ذخیرۂ مخطوطات اشپرانگر سے ایک قلمی بیاض دریافت کر کے اپنے علمی دیباچے کے ساتھ شائع کی تو گویا امیر سے منسوب ۱۴۴ نادریافت پہیلیاں خسروی خزانے میں جمع کیں۔ یہ اور ایسے ہی کئی وقیع کام گزشتہ دس برسوں میں سامنے آچکے ہیں اور اب یہ تار ایسا بندھا ہے کہ ٹوٹنے والا نہیں۔ شکاگو، ٹورنٹو اور لندن میں بھی امیر خسرو سوسائٹیاں قائم ہو چکی ہیں، خصوصاً شکاگو کا مرکز تو دہلوی مرکز سے بھی زیادہ فعال ہے اور اس نے امریکی ہماہمی سے پورا فیض اٹھایا ہے۔

فی الحال جو یہ نذرانہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے قبول کرنے والوں سے عرض ہے کہ اصل عبارت (متن) کے ساتھ ساتھ متعلقہ حوالے اور حاشیے بھی دیکھتے جائیں۔ اوروں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اُسے الفاظ کی اُلٹ پھیر کے ساتھ نقل نہیں کیا گیا۔ صرف تفصیلی مطالعے کی خاطر حوالہ دے دیا گیا ہے۔ جنھیں تفصیل درکار نہیں، ان کے لیے یہ چند صفحات بھی پورے پڑیں گے۔ حوالوں اور حاشیوں پر نظر ڈالتے چلنے سے خسرو کے ذہنی اور جسمانی سفر کا بلکہ پورے سوانحی سفر کا حال کھلے گا اور لکھنے والے کو اپنے کیے کی جزا سزا مل سکے گی۔

فقط

ظ۔ انصاری

یمین الدین، ابوالحسن، خسرو دہلوی کی زندگی، زمانے، حالات اور تصنیفات کو ٹھیک ٹھیک جاننے اور سمجھنے کے لیے ہمارے سامنے کم و بیش پچاس تذکروں اور تاریخوں کے قابلِ ذکر ذخیرے میں سے صرف پانچ ذریعے اعتبار کے قابل ہیں۔ باقی جو ہیں، اُن میں یا تو افسانہ طرازی ہے، تخیل کی کارستانی ہے یا اگلوں کی تکرار۔

پہلا ذریعہ خود امیر خسرو کی تصانیف:

ان میں دیوانِ اوّل "تحفۃ الصغر"، دیوان دوم "غرۃ الکمال" اور دیوانِ سوم "بقیۃ نقیہ" کے دیباچے ہیں۔ دیباچوں کے علاوہ مثنویوں میں دی ہوئی ذاتی تفصیلات۔ مثلاً "مجنوں لیلیٰ" میں بھائی اور ماں کے مرنے کا غم ناک بیان۔ مرثیے۔ "قران السعدین" میں ملتان کے خونیں واقعے اور اپنے بچ نکلنے کا ذکر۔ یا پھر "اعجاز خسروی" میں اپنے ہم عصروں کا، مختلف اسالیب کا، چشم دید واقعات کا، بحثوں کا اشاراتی یا تفصیلی بیان۔ خسرو کے اپنے بیانات میں ہم جیتے جاگتے خسرو سے مل لیتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں دکھنے یا خارش ہو جانے تک کے نجی معاملے کو پچاس اور ستر بیت میں لکھ گئے ہیں لیکن نہیں لکھا تو بیوی بچوں کا حال، اپنے معاشقوں یا عاشقی کی واردات کا تجربہ۔ سو وہ اُن کی شاعری کی چلمن سے جھانک لیتا ہے۔

دوسرا ذریعہ ہے امیر حسن سجزی دہلوی کا کلام اور خواجہ نظام الدین کے احوال واقوال کا

مجموعہ "فوائد الفواد" جو اپنی اصل حالت میں آج تک محفوظ ہے۔ یہ امیر خسرو سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے اور دو سال بعد تک جیئے، اپنی پُر سوز غزلوں میں خسرو سے اگر دو قدم آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں۔ دونوں شروع میں مورخ ضیاء الدین برنی کے دوست تھے اور برنی جس علم و خبر کا آدمی تھا، اس کا یارِ غار ہونا خود گواہی دیتا ہے کہ حسن نانبائی کی دوکان پر روٹی تول تول کر نہیں بیچتے ہوں گے(۱) بلکہ اہلِ علم و فن میں پایہ رکھتے ہوں گے، ورنہ اپنے وقت کا قدر دانِ سخن شہزادہ سلطان (محمد بن بلبن)، شاعروں سے اٹی ہوئی دہلی(۲) میں صرف دو نوعمر شاعروں کا انتخاب کرتے وقت حسن کو نہ چنتا۔

امیر حسن کے ایک قطعے سے تو یہ بھی استنباط ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے معاملے میں اپنے ذوق کو ترجیح دیتے تھے۔

سُخنم چوں سخنِ خسرو نیست
سخن اینست کہ من می گویم

تیسرا ذریعہ خود ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" جو امیر کے انتقال کے ۳۱ ویں سال مکمل ہوئی (۱۳۵۶ء)

مصنف ایک صاحبِ حیثیت مورخ تھا جس نے اپنے پیشرو مورخین (مثلاً قاضی منہاج) کے پُر پیچ طرزِ تحریر سے ہٹ کر سادہ واقعہ نگاری کی زبان اپنائی اور ہر واقعہ لکھنے سے پہلے چھان بین کی، اس پر علاحدہ سے اپنا تاثر بیان کیا۔ واقعے اور اپنے تاثر کو الگ رکھنے میں وہ ابن خلدون (سالِ ولادت ۱۳۳۲ء) کا پیش رو ہے۔

امیر کی جوانی تھی برنی کا لڑکپن، تعلقات برابر کے۔ اُسی کے واسطے سے حسن اور خسرو میں دوستی ہوئی!

"...... و از محبتِ من میانِ ایشاں ہر دو استاد
قرابتے شد و در خانہائے یک دیگر آمد و شد کردن
گرفتند...(۳)"

بعد میں ان دونوں کے مراسم پر دولت شاہ سمرقندی اور محمد قاسم فرشتہ نے جو چٹ پٹے افسانے تراشے، ان کا یہاں دور دور اشارہ نہیں ملتا۔ (مزید ملاحظہ حوالہ نمبر ۳)

چوتھا ذریعہ تیرھویں صدی کے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار محمد عوفی بخاری کا فارسی تذکرہ "لباب الالباب" ہے جو ہندستان میں ہی لکھا گیا۔ مصنف سخن گو بھی تھا، سخن فہم بھی اور معاصرین کو داد دینے میں فیاض بھی۔ اس کی زبانی ہم عصر ادبی ماحول، طرزوں اور پیمانوں کا پتہ چلتا ہے اور ہمیں امیر خسرو کے جیتے جی ان کا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

پانچواں اور نہایت اہم ذریعہ ہے ایک صوفی سرشت سید محمد بن مبارک (الکرمانی) معروف بہ امیر خورد کا تذکرہ "سیر الاولیا"۔ اس نیک طینت مصنف نے جو کار ثواب سمجھ کر اپنی تالیف تیار کرتا ہے، حق گوئی کو شعار بنایا، جو دیکھا یا اپنے والد اور چچا سے سنا، یا بہ تحقیق پایا ــــ وہ جمع کر دیا۔ یہ کتاب ۱۳۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ والد اور چچا خسرو کی طرح خواجہ نظام الدین کی خانقاہ کے حاضر باش تھے۔ وہی ان کی صوفیانہ زندگی کے واقعات سناتے ہیں اور امیر خورد کا بیان ہے کہ: ..... باطن صاف داشت ..... طریقۂ اہل تصوف در صورت و سیرت او پیدا بود .....

ہمارے لئے امیر خورد کا بیان، نظام الدین کے ہاں ان کی حاضری، محفل سماع میں بہلول قوال کا امیر خسرو کی غزلیں گانا، خواجہ کا فرمائشیں کرنا اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ روز کے ملنے والے ضیاء الدین برنی نے ان کی شاعری کے اوج کمال، درباروں میں قدردانی، علم و فضل کا بہت ذکر کیا، تصوف پر روشنی نہ ڈالی۔ اس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ

- امیر کا لڑکپن اور آغاز ویسا گزرا جیسا امیرزادوں کا ہوتا ہے؛
- خانقاہ پر ان کی آمد و رفت عمر اور تلاش سکون کے ساتھ بڑھتی گئی؛
- تمام قدردانیوں کے باوجود امیر خسرو کی روح جھمیلوں سے بیزار اور خنیوں کی طلب گار تھی؛
- خواجہ، سلطان جی، انہیں "نیک چلنی" کی ہدایت کے بجائے عشق انگیز، زلف و خال آمیز شاعری کا مشورہ دیا کرتے تھے کہ عشق کا پتلا اسی راہ سے روحانی تسکین پا سکتا ہے۔
- آخری برسوں میں امیر خسرو اور سلطان جی کے درمیان تمام حجاب اٹھ گئے تھے۔

امیر خسرو کا کلام اُن کی زندگی میں ہی جا بجا نقل ہونے اور پھیلنے لگا تھا، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اسّی برس کے شیخ سعدی کو نمونتہً (ملتان سے) بھیجا گیا؛ اس لئے امیر کو فکر ہوئی کہ کہیں نقل کرنے میں اوروں کی عقل ترمیم و اضافہ نہ کر دے۔ چنانچہ مثنویوں کے آخر میں اشعار کی تعداد، سنہ تصنیف وغیرہ بھی درج کر دیے ۔ اور تاکید کی کہ اس میں کمی بیشی نہ ہونے پائے ۔

هر کو نکند بطبعِ قابل — مابعدِ نوشتنش مقابل

یا بیتے ازیں عدد کند کم — کم باد ور اخلاصی از غم

معلوم نہیں، کتنے کاتبوں کو ان کی بد دعا لگی، بہر حال چند اشعار کی کمی بیشی ہوتی رہی یہاں تک کہ تین ہزار بیت کا پورا "تغلق نامہ" ہی ناپید ہو گیا اور جہاں گیر کے دَور میں ملا بھی تو ڈیڑھ سو کے قریب شعر، اوپر سے جوڑ کر پورا کیا گیا۔

اشعار کی حد بندی کا یہ اہتمام امیر خسرو نے مثنوی اور بعض قصیدوں میں تو کیا، غزلوں کو آزاد پرندوں کی طرح چھوڑ دیا اور تین دیوانوں کی شیرازہ بندی تک غزلوں کا شمار تک نہ کیا، کیوں کہ بقول خود، ہر موزوں طبع شخص دس بارہ غزلیں کہہ کر شاعر شمار ہونے لگتا ہے۔ چوتھے دیوان "بقیہ نقیہ" کے وقت یا تو خود خیال آیا، ورنہ صاحب نظر دوستوں نے سمجھایا تو غزلوں کو دیوان میں ڈال کر اُن کا رتبہ بڑھا دیا[۴]۔

یہی غزلیں ہیں جو قبول عام کے پرلگا کر اُڑ گئیں اور تمام و کمال پھر نہ جُڑ سکیں۔ انھیں جوڑنے کی کئی کوششیں ہو چکی ہیں مگر انجام تک پہنچنے سے پہلے رہ جاتی ہیں۔

دولت شاہ سمرقندی راوی ہے کہ (امیر تیمور کے پوتے) سلطان سعید بائسنغر خاں نے پندرھویں صدی میں بڑی کوشش کی، (اپنے شاعر خاص سیفی کو اس کام پر لگایا۔ یہ بات بعد کے تذکرہ نگاروں نے بتائی)، برسوں میں جا کر ایک لاکھ بیس ہزار شعر جمع ہوئے۔ پھر ایک جگہ غزلیات کے دو ہزار شعر ایسے ملے جو کسی دیوان میں درج نہ تھے، آخر تھک ہار کر ہاتھ کھینچ لیا۔ سیفی شاعر کا جمع کیا ہوا کلیات (منقولہ ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء) ۸۹۴ صفحات میں آج تک لینن گراد شچدرین کتب خانے میں محفوظ ہے(۵) اور اس میں بھی پانچواں دیوان نہایتہ الکمال اور کئی مشہور غزلیں غائب ہیں، مثلاً

...... شب جائے کہ من بودم

یا

.... من تو شدم، تو من شدی

وغیرہ

ہرات کے گورنر وزیر امیر علی شیر نوائی کو بھی امیر کا کلام جمع کرنے کی تمنا تھی۔ جامی جیسا فاموس ان کے دربار کا رتن تھا۔ پھر بھی کام "خمسہ" سے آگے نہ بڑھا۔ البتہ مصوری کے ہرات اسکول نے مثنویوں کے بعض مناظر کو تصویری لباس دینے میں پہل کی۔

ہندوستان میں امیر کا کلام مدتوں داخل نصاب رہا۔ شہزادوں کے لئے نقل کیا گیا، انھیں پڑھایا گیا، مصور کیا گیا، فیضی جیسے بحر العلوم اس کے دلدادہ تھے، کلیات کے نام سے کئی نسخے تیار ہوئے، مگر سب تعداد میں ناقص۔ یہاں تک کہ امیر کے مختلف دیوانوں سے انتخاب تیار ہوئے اور انھیں کلیات کا نام دیا جانے لگا۔

۱۸ ویں صدی کے آخر میں ہندوستان نے چھاپہ خانہ دیکھا اور ۱۹ ویں صدی کی پہلی چوتھائی میں کلکتے سے جو اولین کتابیں چھپ کر نکلیں ان میں خسرو کی "مجنوں لیلی" شامل تھی۔ (۱۸۲۸ء ۱۲۴۴ھ) میں یہ خسرو کی پہلی تصنیف تھی جو احتیاط اور اہتمام سے چھپی۔ پھر کوئی چالیس برس کے وقفے سے کانپور، کلکتہ، دہلی اور بمبئی سے کئی مجموعے نکلے۔ ایک، جو آج بھی مل

جاتا ہے ۱۸۷۰ء میں کان پور سے کلیات عناصر دواوین امیر خسروؒ کے نام سے نکلا تھا، پھر نول کشور پریس لکھنؤ سے برابر چھپتا رہا اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خود شاعر نے ترتیب دیا تھا۔ طرز انتخاب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ "مطلع الانوار" دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ "قران السعدین"، لکھنؤ اور بمبئی میں ۱۸۴۵ء اور ۱۸۷۱ء میں چھپی۔ ایران میں اس کی اشاعت کئی سال بعد عمل میں آئی۔

۲۰ویں صدی کے آغاز میں امیر خسرو کے کلام پر خاص توجہ ہونے لگی۔ غالباً اس کا سبب تھا ہندستان کے انگریز مورخین کی تلاش، جنھوں نے خسرو کی نظم و نثر کو اپنے تحقیقی کام میں رجوع لائق نہیں تھا، خبر رساں کا درجہ دے دیا۔ تبھی دہلی کے مطبع قیصری سے ان کا نہایت کمیاب دیوان "نہایۃ الکمال" اور دیوان "غرۃ الکمال" کا دیباچہ شائع ہوا (۱۹۱۴ - ۱۵ء)

یہ اشاعتیں نقیب تھیں خسرو شناسی کے دورِ ثانی کی جسے ایک صاحب نظر، صاحب علم اور صاحب مرتبہ ہستی یعنی سید حسین بلگرامی (عماد الملک)، کا عزم تصیب تھا۔ انھوں نے نواب اسحاق خاں (سکریٹری ایم اے او کالج حال مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کو ساتھ لے کر بیڑا اٹھایا کہ خسرو کا تمام کلام دنیا کے چپے چپے سے جمع کر کے، علمی دیباچوں سمیت شائع کیا جائے۔ نواب صاحب اپنی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں لکھتے ہیں۔

> ...... یوروپ کی لائبریریوں میں سے کسی میں اب تک کسی ایسے نسخے کا پتہ نہیں چلا جس کا، مابعد تحقیقات سے، ہندستان کی کسی نہ کسی لائبریری میں سراغ نہ لگایا گیا ہو لیکن اگر آیندہ کسی نئی تصنیف کا پتہ چلا تو فوٹو کے ذریعے اس کی نقل حاصل کی جائے گی ...... (ص ۴۳)

چناں چہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان "خمسہ" کی پانچوں اور تین تاریخی مثنویاں علی گڑھ سے نکل گئیں جن پر جدا جدا کئی علمائے وقت نے کام کیا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوی کا مشہور اور منسوب کلام "جواہر خسروی" کے نام سے تیار اور طبع ہوا۔ تاریخی نثر "خزائن الفتوح" بھی انہی دنوں ترجمے کے ساتھ چھپی۔ "تغلق نامہ" کا مخطوطہ دیر سے ملا اور ۱۹۳۳ - ۳۴ء میں فاضلانہ مقدمے کے ساتھ علی گڑھ سے ہی نکلا۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے جو ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کے لئے انگریزی میں خسرو کی حیات و آثار پر کتاب پیش کر چکے تھے

۱۹۴۸ء میں کلکتے سے چوتھی تاریخی مثنوی "نہ سپہر" بھی شائع کردی۔

ضخیم نثری کارنامۂ اعجاز خسروی "یا رسائل الاعجاز" کے پانچوں رسالے دو جلدوں میں نول کشور پریس سے ۱۸۷۶ء میں چھپے تھے، وہی آج تک چلے آرہے ہیں عصری معلومات کے اس خزانے کو طرز جدید سے مرتب کرکے چھاپنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسی طرح "رباعیات" بھی الگ الگ مخطوطوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں صرف ایک بار بمبئی کے کریمی پریس سے ایک جلد میں چھپی تھیں، مگر ناقص۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان ایران، افغانستان اور تاجیکستان میں امیر خسرو کے "منتخبات" چھاپے گئے۔

تہران سے ایسے ہی ایک منتخب کو "دیوان کامل" کہہ کر، مگر بے پروائی سے، پروفیسر سعید نفیسی مرحوم کے مختصر سے دیباچے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ پاکستان سے سعدی و خسرو کی ہم طرح غزلوں کا ایک مجموعہ احتیاط اور نفاست کے ساتھ نکلا۔

۱۹۶۹ء کے ساتھ خسرو شناسی چوتھے اور تازہ ترین دور میں داخل ہوئی ہے اور اس کا سہرا ہے سوویت فاضل، مورخ، اکادمی شین باباجان غفوروف کے سر جنھوں نے غالب صدی کے دوران اپنے یہاں کے اور ہندستان کے علما کو ادھر توجہ دلائی۔

"خمسہ" کی پانچ مثنویوں پر اب تک کم از کم ۸ سوویت اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی کرچکے ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم نام ہے مرحوم محمد وفا بقائیف کا، جنھوں نے "دول رانی خضر خاں" پر، ۱۱ سال پہلے کام شروع کیا تھا اور اس کے بعد تمام عرصے امیر خسرو کے کلام اور زندگی کی چھان بین میں لگے رہے۔ انھی کی تحقیق کا نتیجہ خسرو پر ایک مونوگراف کی شکل میں بزبان تاجیکی تیار تھا (۱۹۷۱ء) کہ وہ دنیا سے اٹھ گئے۔ انصاف کی رو سے دیکھا جائے تو محمد وحید مرزا کے بعد سب سے وزنی کام انھی کا ہے۔

افغانستان کی "وزارت عامہ اطلاعات و کلتور" نے اپنے ملک کے سب سے بڑے خسرو شناس ڈاکٹر روان فرہادی کو اس کام پر لگایا اور اب تک حیات و آثار کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چوتھی جلد میں اس سیمینار کے مقالے جمع ہیں جو کابل میں وزارت مذکورہ کی طرف سے مارچ ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا تھا، اسی وضع کے سیمینار دوشنبہ (تاجیکستان) اور باکو (آذربائیجان) میں اسی سال منعقد ہوئے۔ تصانیف شائع ہوئیں۔ جن میں راقم السطور کی خدمات کا بھی اعتراف

کھلے دل سے کیا گیا ہے۔

پاکستان میں امیر کی غزلوں کی چار جلدیں۔ اقبال صلاح الدین اور وزیرالحسن عابدی کی ترتیب اور تصحیح کے ساتھ نہایت آب وتاب سے شائع ہوئی ہیں (۷۵، ۱۹۷۲ء) مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں۔

امیر خسرو کے نہایت مستند اور تاریخی نسخے تاشقند، لینن گراد، شرقی برلن، آکسفورڈ، لندن، بیجاپور، مدراس اور بانکی پور کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ بعضوں تک تو پچھلے کئی سو سال کے دوران صرف ، یا ، ہاتھ ہی پہنچے ہیں اور اب وقت آیا ہے کہ انھیں منظر عام پر لایا جائے۔

بڑا شاعر، فنکار یا مفکر اپنے بعد کی نوع انسانی اور انسانیت کے لئے ناقابل تقسیم ورثہ ہوتا ہے۔ امیر خسرو بھی ہیں تاہم ہندستان پر ان کا حق زیادہ ہے اور یہ ادبی فرض ایک قومی فرض کی طرح اب قبولا گیا ہے۔

لفظ و معنی کا یہ نذرانہ دنیائے ادب کی اُس عظیم الشان ہستی، ہندستان کے اُس سپوت کی یاد میں پیش کیا جارہا ہے جس کے فکر و فن کی سطحیں برابر بدلتی رہیں۔

اور جس نے اب سے ٹھیک سات سو سال پہلے (۶۹۴ھ) ۴۲ سال کی عمر میں اپنا تیسرا اور سب سے ضخیم دیوان مرتب کرنے کے بعد کہہ دیا کہ "یہ غرۃ الکمال" ہے۔ تب تک خسرو کے ہزاروں اشعار درباروں، محفلوں، گلی کوچوں، ہاٹ بازاروں میں گائے جا چکے تھے، والیانِ حکومت اُن کی قربت کے آرزو مند ہو چکے تھے اور گاؤں گاؤں شہرت و مقبولیت پہنچ چکی تھی۔

امیر خسرو اپنے کمال کی اس قدر دانی اور عوام پسندی سے مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدے کو بھی وسعت دی۔ زندگی کو ایک ایک پہلو سے برتا، پرکھا، اپنایا اور نوکِ قلم سے زرنگار نقش ابھارے، یہاں تک کہ ان کی شخصیت اپنے تاریخی دور کی ترجمان بن گئی، وہ شخصیت جو طرح طرح کے تجربوں کا رنگ جذب کر چکی تھی۔ اُن کی نظم و نثر سیاسی اور سماجی تاریخ کا ایک مستند ذخیرہ ثابت ہوئی، اپنے زمانے کی سب سے اہم تہذیبی تحریک نے اُن کے نغموں کی بدولت قبولِ عام پایا، اور ان کا کلام وقت کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر انسانی ہمدردی، راحت، لطف و لذت کا ایسا لازوال کارنامہ ثابت ہوا جس کے قیمتی نسخے ملک سے باہر دور دراز کے کتب خانوں میں، سرحد پار کے کتاب خوانوں اور فارسی دانوں میں سرمۂ اہلِ نظر بن

گئے ہیں۔"زمان و مکان کے فاصلے نے ان کا قد کم نہیں کیا۔

امیر خسرو فی الوقت دنیا کے پانچ ملکوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں[9] ہندستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور تاجیکستان (سوویت یونین)۔

پانچ کے عدد کو، نجانے، ان سے کیا پُراسرار نسبت ہے کہ :

- ۷۲ برس کی پُرآشوب، ہنگامہ طلب اور مصروف زندگی میں وہ پانچ بادشاہوں کے درباری رہے[10]
- پانچ فرمائشوں پر انھوں نے ایسی پانچ تاریخی مثنویاں لکھیں کہ ان کا جواب آج تک نہ لکھا جا سکا[11]
- یکے بعد دیگرے پانچ دیوان مرتّب کئے؛ ان سے پہلے فارسی کے کسی شاعر کو یہ توفیق نہ ہوئی تھی[12]
- اخلاقی اور افسانوی مضامین کی پانچ مثنویوں کا خمسہ مکمل کیا جس میں ۱۸۰۰۰ شعر ہیں۔ ان کے بعد سے نسل در نسل "خمسہ" لکھنے کا رواج چل پڑا[13]
- انھوں نے بیک وقت پانچ زبانوں میں طبع آزمائی کی جن میں تنہا فارسی کے کم و بیش پانچ لاکھ شعر چھوڑے[14]
- نثر میں رسائل کے پانچ دفتر رسائل الاعجاز لکھ کر یکجا کر دئے جو آج بھی تہذیبی تاریخ کے لئے معلومات کا سرچشمہ ہیں[15]
- پانچ شہروں میں انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ گذارا، کبھی خوشی سے، کبھی ناخوشی سے[16]
- ملک کے مختلف مقامات پر پانچ جنگوں میں کمر سے تلوار باندھ کر شریک ہوئے[17]
- اپنے زمانے تک کے پانچ علوم و فنون کی تمام ترقیوں سے آگاہی بلکہ معرفت حاصل کی[18]
- اور پانچ زبانوں کے عوامی و علمی خزانے سے فیض اٹھایا[19]

آج امیر خسرو کا مطالعہ کرنا، اُن کی یاد تازہ کرنا، محض ایک بڑے شاعر، پچھلی دنیا کے ایک اہم شاعر اور فن کار سے آگاہی یا لطف اندوزی ہی نہیں، بلکہ ہندستان کے موجودہ ہزار سالہ

دور کی پہلی مرکزی سلطنت، کل ہند نظامِ حکومت کے تانے بانے اور اس کی قوت کے راز معلوم کرنا بھی ہے۔ شمس الدین التمش کے تسلط (۱۲۲۰ء) سے لے کر محمد تغلق کی تخت نشینی (۱۳۲۵ء) تک پورے سو سال وہ کون سا دستِ غیب تھا جو ہندستان کو سیاسی جبر اور تہذیبی سماجی اختیار کے ساتھ ایک رشتے میں پروتا گیا اور اسے روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت کی حیثیت سے بچائے بھی رہا۔"[۲]

اسی تاریخی ٹھوس حقیقت کی راہ پر جس سے ہمارا زندہ اور توانا رشتہ برقرار ہے، اور یہ رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ہمیں پچھلے ورق اُلٹنے اور پھر سے ٹٹول کر مرتب کرنے بھی ہیں، امیر خسرو کا وجود چراغ لیے کھڑا ہے کہ وہ ہم عصر شاعر سے بڑھ کر سچّا اور مورخ سے بڑھ کر دلاویز، دلگداز اور ہمدرد ہے۔"[۲]

جلال و جمال کا ایک ایسا شیرازہ ہیں امیر خسرو کہ ہمیں اپنی شیرازہ بندی کے لیے اُن سے تجربہ، سلیقہ اور درد مول لینا ہے۔

امیر خسرو کی سیرت اور بصیرت کی تلاش میں ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اس نقطۂ اتصال پر براجمان ہیں جہاں اسلام کی چھ صدیاں اُن سے آگے گئیں اور چھ صدیاں ان کے بعد گزریں۔ تب تک کے سیاسی تہذیبی حالات میں اسلام کی اثر اندازی اور اثر پذیری کا رنگین، بھرپور اور جاندار منظر جو امیر کی تحریروں اور سرگرمیوں سے ہم پر کھلتا ہے وہ ہمیں آج کے حالات کے تقابلی مطالعہ کرنے میں اور مستقبل کے ہندستان اور اسلام کے باہمی رشتے جاننے میں مدد دیتا ہے۔"[۲۲]

فنی خصوصیات کے علاوہ یہ ایک اہم پہلو ہے جس سے ہماری نظر فیضیاب ہوتی ہے۔

وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین جو افغانوں سے ربط ضبط رکھتا تھا، سمرقند کے نزدیک شہر کش (KESH) سے جو دو سو برس بعد "شہر سبز کہلایا"[۲۳] چنگیز خانی خونخوار حملوں میں بے وطن ہوا اور بلخ میں آبسا جو اس وقت زبردست قلعہ بند اور تہذیبی مرکز شمار ہوتا تھا۔[۲۴]

۱۲۲۰ء میں ایک زبردست منگول فوج خود چنگیز خاں کی سالاری میں ترمذ اور بخارا کو تباہ اور مسمار کر کے بلخ کی طرف بڑھی اور اگلے سال ۱۲۰۰ مسجدوں اور ۲۰۰ حماموں کے اس عظیم شہر میں بھی کوئی چراغ جلانے والا نہ رہا[۲۵]۔ امیر سیف الدین اپنے لاچین قبیلے کی ایک ہزارہ "شاخ کے پناہ گزیں سردار، حملے کے وقت یا حملے سے پہلے ۱۲۲۱ء اور ۱۲۳۵ء کے درمیان بلخ چھوڑ کر ہندستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پنجاب اور دریائے سندھ کی وادی اس وقت چنگیزی خونخواری سے سہمی ہوئی تھی۔ دہلی کے ہوشیار، موقع شناس سلطان شمس الدین نے، خوارزم شاہی ترک سپہ سالار جلال الدین کو نہ صرف یہ کہ مدد دینے سے انکار کر دیا بلکہ جیلے حوالے اور فوجی تدبیر سے پنجاب میں اس کی سرگرمیاں توڑ دیں اور یوں اپنے سرحدی علاقے کو خوفناک جنگی میدان بننے سے بچا بھی لیا اور اپنے یہاں اُدھر کے اجڑے ہوئے بہترین شہسواروں کو ملازمت یا پناہ دینے کی راہ بھی ہموار کر لی۔

سیف الدین لاچین انہی میں سے ایک تھے۔ چند سال معمولی خدمتوں پر رہنے کے بعد انھیں متھرا سے ایٹہ جانے والی شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی قصبے (عرف مومن پور) میں چھوٹی سی جاگیر گزارے کو دے دی گئی۔" غالباً افغانوں سے دور کی قرابت کو مدنظر رکھا گیا، یا پھر اس شورہ پشت علاقے میں، جہاں افغانوں کی تین گڑھیاں لگی ہوئی تھیں، مرکزی ترک حکومت نے اپنا وفادار نگہبان بٹھا دیا۔

سیف الدین لاچین کی شادی ایک سیاہ فام ہندستانی امیر عماد الملک کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی جو شوہر کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی اکثر پٹیالی میں رہی۔ چار بچے ہوئے، ۳ لڑکے، ایک لڑکی۔ یمین الدین خسرو ان میں منجھلے تھے۔ ۱۲۵۳ء (۶۵۱ھ) میں پیدا ہوئے۔

نام خسرو، لقب یمین الدین اور کنیت ابوالحسن۔ یہی ابوالحسن یمین الدین بعد میں اپنے نام، تخلص اور موروثی خطاب "امیر" کے جوڑ کی بدولت امیر خسرو کہلائے۔

پس منظر کی یہ ہلکی سی تفصیل اس لیے ضروری ہو گئی ہے کہ بعض لوگ انھیں بلخی معروف بہ دہلوی" لکھتے ہیں، بعض ان کے والد کو "شمسی غلام"۔ حالاں کہ امیر خسرو کے اپنے بیانات اور معاصر تاریخوں اور تذکروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ننھیال کے سانچے میں

یمین الدین نے صرف سات برس کی عمر تک باپ کو دیکھا، وہ بھی وقفوں سے۔ کیوں کہ وہ جنگی معرکوں پر باہر جاتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی خانہ نشین امیر زادی ماں کو، ماموں کو، نانا کو دیکھا، جانا، انہی سے باپ کے قصے سنے ہوں گے کہ وہ لکھتے ہیں:۔

> گویائی جو انسان کی بہترین صفت ہے، انھیں غیب سے جی بھر کے ملی تھی، مگر خاموشی پسند آدمی تھے ..... ترک صرف سونے میں فرشتہ ہوتے ہیں مگر میرے باپ جاگتے میں فرشتہ تھے، ایسے نیک چلن تھے کہ سیاہ چشم حور کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتے ......[۲۷]

اس سے کہیں زیادہ تفصیل اپنے نانا کے بیان میں دی ہے جو ایک سو تیرہ[۱۳] برس کے ہو کر مرے۔ تب خسرو بیس[۲۸] سال کے تھے۔ نانا عماد الملک کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سلطنت کے

چار ستونوں میں سے ایک تھے۔ ستر سال عارض ممالک (سکریٹری محکمہ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو ہزار ہند (پیدل) اور دو ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ عمدہ کھانوں اور پانوں کے بڑے شوقین ہوں گے کیوں کہ ہر مہمان کو متواتر پان پیش کیے جاتے تھے اور پچاس ساٹھ آدمی عرف پاندان، خاصدان پر ملازم تھے۔ بے انتہا سخی آدمی بتائے جاتے ہیں۔

جہاں ان بیانات سے یہ کھلتا ہے کہ عماد الملک چوٹی کے ذمہ دار اور قابل اعتماد امیروں میں سے گزرے ہیں، وہیں یہ بھی کہ وہ ایک نو مسلم ہوں گے، ہندستانی نژاد ہوں گے، راجاؤں سے اور دشمنوں سے صلح صفائی کرانے میں لگے رہتے ہوں گے۔ اعلا درجے کے کامیاب ڈپلومیٹ ہوں گے۔ ستّر سال میں غوریوں کے دور سے بلبن کے زمانے (۱۲۷۲ء) تک پانچ بادشاہوں کا عروج و زوال نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ خود کو سنبھالے ہوئے ایک اونچے عہدے پر قائم رہے تھے۔

خسرو بالآخر انہی کے نواسے نکلے۔

ننھیال میں پلے تھے، ننھیال سے عشق تھا، اسی کے تربیت یافتہ اور طرفدار ثابت ہوئے۔

زبانوں کا ماحول

بچپن جس علاقے میں گذرا وہ برج (یا برج بھاشا) کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ کرشن نگری ہونے کے باعث برج کے گیت اور بھجن اپنی مٹھاس، وسعت، نفاست میں ادبی شان اختیار کر چلے تھے۔[۲۸]

نانا کا قیام دلی میں تھا، بڑی حویلی، باہر خدمت گاروں کے رشتہ داروں کے مکانات، باپ کے انتقال کے بعد خسرو اکثر دلی آئے گئے۔ ان کی مکتبی تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ اچھی صحبت بھی یہیں میسر آئی۔ طبیعت میں بچپن سے کھلنڈرا پن تھا اور شعر گوئی کا چسکا بھی "دودھ کے دانت گرتے وقت منھ سے موتی جھڑتے تھے"۔[۲۹] بھری محفل میں شعر سنانے سے نہیں ہچکچاتے تھے، کتاب کے بجائے چوری چوری حسینوں کے مکھڑے تکا کرتے اور پھبتیاں کسا کرتے۔

ظاہر ہے کہ ان عادات کا بچہ گلیوں میں، نوکروں اور ہمسایوں میں گھومتا، دھوم مچاتا پھرے گا اور یہ تھا ڈھلی ہوئی شہری کھڑی بولی کا علاقہ — جسے وہ ہریانوی، ہندوی یا دہلوی کہتے ہیں۔

اس کی آوازوں میں ایسا کھڑا پن ــ بلکہ سپاہیانہ کھُردرا پن تھا جو برج بھاشا (بھاکا) کی نرم آوازوں کی تکمیل کرتا ہے۔ ۱۲۷۲ء تک انھوں نے آزادی اور بے فکری کے دن گزارے، شعر کہے، سنائے داد پائی، اور ذی علم عزیز دوستوں (مثلاً تاج الدین زاہد) کے کہنے پر ایک دیوان تحفۃ الصغر کے نام سے تیار کر دیا[۳]۔ اس دیوان کا دیباچہ ان کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بڑے مزے میں سناتا ہے۔

جب وہ اپنی عمر کے ۲۱ ویں سال آزادانہ تلاش معاش کے لئے نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک اچھا خاصا دیوان ان کے ساتھ تھا۔ چھوٹتے ہی سلطان کے شاہ خرچ بھتیجے علاءالدین کشلو خاں (کشلی خاں یا ملک چھجّو) نے اپنے دربار کی زینت بنایا۔ کول (علی گڑھ) اس کی جاگیر میں تھا۔ وہاں بھی اس کے ہمرکاب جاتے ہوں گے۔ شروع سے ہی اس کی نظر میں چڑھے اور آئے دن کی بخششوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ شام کو شراب و کباب، رقص و سرود کی محفلیں جمتیں اور نوجوان، بانکے خسروان میں اپنے کلام اور اپنے جام زرہمیت شریک ہوتے۔ محفل اُن کے دم سے رونق پاتی اور وہ محفل کی خاطر، نہ صرف غنائی شعر لکھتے بلکہ اُس کی نغماتی ادائگی کی تیاری بھی کراتے۔ سنگیت کی چاٹ انھیں لگ چکی تھی۔

منچلے لکھ لُٹ امیروں کا ماحول

وہ مَلِک علاءالدین کشلی خاں عرف مَلِک چھجّو کے ہاں شاعر خاص بن کر دو[۲] سال رہے۔ یہ وہ نوجوان تھا جس کے باپ اور چچا (بلبن) غلام کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئے تھے[۳۱] اور اب منگولوں کی غلامی سے بچنے کے لئے مسلم ملکوں کے اُمرا، وزرا اور شاہی خاندانوں کے وارث سیکڑوں کی تعداد میں ان کا دامن تھامے پڑے تھے۔ جگہ جگہ کے خزانے پنجاب، سندھ اور کشمیر کی راہ سے دہلی اور نواحِ دہلی میں پہنچ چکے تھے۔ بلبن نے تخت حکومت پر آنے سے پہلے ہی اپنے نیک نفس آقا ناصرالدین محمود کے اختیارات کی باگ ڈور سنبھال لی تھی اور اس کے جاہ وجلال کا یہ شہرہ تھا کہ خود "ہولاگو" (ہلاکو) خاں نے اپنے سفیر بھیجے تو وہ دہلی دربار کی شان اور قوت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پھر ایک زمانے تک چنگیز کے حوصلہ مند بیٹوں، پوتوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی دہلی کی طرف بڑھنے کی۔

ایک طرف خزانوں کا اِدھر ڈھلاؤ، دوسری طرف شمالی مغربی سرحدوں سے اور ناگہانی انقلاب حکومت کے خطرات کا احساس، پھر یہ کہ بڑی بڑی جاگیروں کی آمدنی ۔ اور ان سب پر طرّہ تھا دولت اور سیاسی قوت کی نئی نئی آمد۔ نئے امیروں کے درمیان اَندا دُھند خرچ اور سخاوت میں مقابلہ رہتا تھا۔ ایک شاعر شمس مُعین نے شاہی دربار میں اِسی علار الدین کشلی خاں کی پیشی کے وقت سلطانی مطربوں کی زبانی ایک نظم و غزل پیش کرائی تو

.... ملک علار الدین نے خوش ہوکر اپنی پائگاہ (جاگیرِ خاص) کے تمام گھوڑے شاعر کو بخش دیے اور گانے والوں کو دس ہزار روپے کی رقم اوپر سے دی .....(۴۲)

خراسان و ہندستان میں اس کا نام اتنا مشہور خاص و عام ہوچکا تھا کہ بادشاہ اپنے گورنر بھتیجے سے جلنے لگا۔ امیر خسرو کو اپنا یہ پہلا ممدوح اتنا پسند تھا کہ وہ دوستوں سے کہا کرتے تھے :

"ملک علار الدین محمد کشلی خاں جیسا سخی، اندا دھند لٹانے والا، نشانہ باز، شکاری اور پولو کھیلنے کا ماہر، کوئی مائی کا لال ہو نہیں سکتا۔"(۴۳)

بلبن کے مزاج میں درشتی تھی۔ وہ مدّاحوں، شاعروں اور گویّوں کو منہ نہیں لگاتا تھا لیکن اُس کے مَنچلے بیٹے، بھتیجے، گورنر اور امرا اپنی اپنی ڈیوڑھیوں اور حویلیوں میں عیش و عشرت کے تمام سامان سجائے رکھتے تھے اور فکرِ فردا سے بے نیاز دونوں ہاتھوں سے آسمانوں سے برسی ہوئی دولت لٹاتے تھے۔

دوسرا سخی جس نے اپنی بے نیازانہ طبیعت اور عالی ظرفی میں نام پایا خود بادشاہ کا بڑا بیٹا بُغرا خاں تھا۔ ایک بار وہ اسی چچازاد بھائی کے مکان پر اپنے خاص شاعروں اور علمائے وقت شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر کو ساتھ لیے ہوئے مہمان تھا۔ محفل جمی، سب نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خسرو اپنی وجاہت، اپنے کلام اور ادائگی، دونوں سے چھا گئے۔ ان پر اشرفیاں بھی برسیں اور بغرا خاں نے اٹھنے سے پہلے انھیں طشت بھر کر "نقرہ خام" بھی دیا۔ خسرو کی چاندی ہوگئی۔ لیکن کشلی خاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور برتاؤ ایسا بدلا کہ

.... خواست کہ مرا نشانۂ بلا سازد ...... خیال آں ہم در دلم بگزشت ....
چوں تیز جستم و حیلہ کردم و بر عزم خدمتِ ملوک سامانی، راہِ سامانہ پیش گرفتم ......

کشلی خاں کے غصے کا تیر لگنے سے پہلے ہی وہ تیر کی طرح نکلے اور سیدھے بغرا خاں کے پاس سامانہ پہنچ گئے۔

سامانہ (پٹیالہ کے نزدیک) پنجاب اور کشمیر کے راستے میں دہلی سلطنت کی بڑی چھاونی تھی۔ وہاں مضبوط اور قابل اعتماد گورنر رکھا جاتا تھا۔ کم از کم دو بار منگول فوجی حملہ آور سامانے کا قلعہ کتراکر دہلی کی طرف بڑھے اور سامانے کی فوج نے ان کی سپلائی لائن کاٹ دی۔

ناصر الدین بغرا خاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنالیا۔ مزے میں گزرنے لگی۔ یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی ہوگی اور اس کے لوک گیتوں کی لے۔ جو ہندستان اور خراسان دونوں کے سنگیت سے الگ اپنا بانکپن رکھتی تھی[۲۴]

اُن کے مراتب بلند ہوتے جارہے تھے کہ ناگاہ بنگال میں وہاں کے بلبنی گورنر طغرل نے بغاوت کردی۔

طغرل نے اڑیسہ کے ہاتھی اور خزانہ لوٹ کر تمام علاقے میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، بڑی فوج جمع کرلی اور دہلی کے سرکاری اہلکاروں کو ملالیا۔ اس نے بغاوت کا وقت بھی اپنے پیش رو باغیوں کو دیکھ کر چنا ہوگا کیوں کہ بارش کا موسم سامنے تھا۔ دریاؤں میں طغیانی اور بنگال تک باہر کی فوج پہنچنے کے راستے بند۔

بغرا خاں کو حکم ہوا کہ پنجاب کی فوج لے کر بنگال کی طرف بڑھے۔ نہ یہ تاریخ ہند کا پہلا واقعہ تھا نہ آخری کہ مرکز سے تعزیری فوج بنگال پہنچی۔ راستوں کو صاف کر کے پہنچتے پہنچتے سال بھر لگ گیا۔

۱۲۷۹ء میں لکھنوتی۔ جو بنگال کے گورنر کا صدر مقام تھا، دہلی اور پنجاب کی فوج کی تلواروں سے سرخ ہوگیا۔ معاصر ادب اور تاریخوں سے[۲۵] پتہ چلتا ہے کہ لکھنوتی (موجودہ مرشد آباد) میں سر بازار پھانسیاں اور ٹکٹکیاں لگائی گئیں، مشتبہ ملازموں اور مجرموں کو بیل اور گدھے کی کھال میں بھرا گیا اور اتنی دہشت پھیلائی گئی کہ خود شہزادہ بغرا خاں تھرا گیا۔ اسے گورنر مقرر کر کے "بے رحمی" برتنے اور اپنے ہم نشینوں اور مشیروں سے ہوشیار رہنے کی نصیحتیں کر کے جب بلبن کئی مہینے بعد واپس ہونے لگا تو خسرو بھی[۲۶] واپس آنا چاہتے تھے۔ قتل و غارت گری کا یہ منظر اور پھر بنگال کی مرطوب

آب و ہوا۔ بی نہ لگا۔ بغرا خاں نے روک لیا۔ پھر بھی وہ چھ مہینے کے اندر اندر ماں اور عزیزوں سے ملنے کا عذر کر کے دہلی چلے آئے۔

تیسرا اپنے دور کا سب سے فیاض ملک[۴۲] امیر علی سر جاندار (کیڈٹ کور کا افسر) جو حاتم خاں کے نام سے مشہور ہوا، خسرو کا منتظر تھا، لیکن شاعر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد قاآن ملک صاحب نظر بھی ہے، اقبال مند بھی، سپہ سالار بھی ہے اور ولی عہد بھی؛ اسی سے ربط قائم کیا جائے۔ ۱۲۸۰ء میں وہ ملتان سے دہلی آیا تو امیر پٹیالی سے دہلی پہنچے، شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلام سنایا، شہزادے نے انھیں اور ان کے عزیز دوست امیر حسن سجزی کو چن لیا۔

برج اور کھڑی بولی کے بعد پنجابی

پنجاب اور سندھ دونوں کے لئے ملتان مرکزی فوجی مقام، علما، صوفیا، شعرا اور عراق و عرب کے موسیقاروں کا گڑھ تھا۔ شہزادہ ذی علم بھی تھا، بہادر بھی، شاعری اور موسیقی دونوں کا رسیا۔ میدان جنگ اور محفل رنگ و آہنگ دونوں میں بے مثل شخصیت کے ہونہار شہزادے کا دربار دہلی کے ان دونوں شعرا کے لئے اہم تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر نے اپنا دوسرا دیوان "وسط الحیوٰۃ" ترتیب دیا، یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو ہندستانی موسیقی سے جوڑا جو آگے چل کر قول (قوالی) نہ) کہلایا، یہیں عربی اور تورانی سازوں کو پنجاب کے لوک گیتوں کے لئے استعمال کیا، یہیں انھوں نے بیک وقت عربی اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور ۲۳ قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے جو تب تک کسی کے لئے نہ لکھے تھے۔ پہلے پہل انھیں ایک لائق ممدوح ملا تھا جس نے دہلی سے واپس آتے ہی پوری قوت کے ساتھ سرحدی علاقوں کو منگولوں سے اور اپنے ماحول کو بدباطنوں اور بے تہوں سے پاک کر کے ایک سنجیدہ اور علم پرور فضا قائم کی جو خسرو جیسے جی نی ئیس اور امیر حسن جیسے صاحب درد شاعر کی تربیت میں بہت کام آئی۔

بمشکل ساڑھے چار سال گزرے ہوں گے کہ ۱۲۸۵ء میں ایران کے حاکم ارغون خاں بن اباق خاں بن ہولاگو ہلاکو خاں نے ہندستانی سپاہ سے اپنے پچھلے مقتولوں کا انتقام لینے کے لئے چنگیزی امیر تیمور خاں کو ۲۰ ہزار (بقول بعضے ۳۰ ہزار) کا لشکر جرار دے کر لاہور اور

دیپال پور کے راستے ملتان بھیجا۔ سلطان محمد کو غنیم کے حملے کی اطلاع دیر سے ملی یا غلط ملی، پوری تیاری کیے بغیر اس نے دریائے راوی پار کیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کو کچھ دور پسپا کر دیا، امیر کا بیان ہے کہ فتح قریب تھی کہ ہوا پلٹ گئی۔ دوسرے مورخین بتاتے ہیں کہ ہندستانی فوج (جس میں سرحد کے پٹھان شامل تھے) دشمن کا پیچھا کرنے میں بکھر گئے اور شہزادہ مغرب کی نماز شکرانہ میں لگ گیا کہ اتنے میں کمیں گاہ سے حملہ ہوا اور منگولوں کے تیر نے اُسے ہلاک کر دیا۔ سردار کا ہلاک ہونا تھا کہ ملتان کی فوج پس گئی اور ہر طرف بربادی پھیل گئی۔

امیر خسرو میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہوئے ایک منگول سوار کے ہاتھ پڑے، منگول سوار امیر کو قیدی بنا کر لے چلا۔ منگول لشکر عموماً سردیوں میں حملہ آور ہوتے تھے، اِس بار مارچ کی جاتی سردیاں تھیں۔ دن میں گرمی پڑنے لگی تھی۔ فاتح سوار شمشیر بدست شاعر کو رسی میں کھینچتا، دوڑاتا ہوا لے چلا۔ دریا نظر پڑا تو پیاس کے مارے منگول نے دریا کنارے گھوڑا اڑا لا۔ سوار اور سواری دونوں نے ڈگڈگا کر پانی پیا[۲۸]

هم او سیراب شد، هم مرکبش سیر
نشد در دادنِ جاں ہر دو را دیر

وہ دونوں تو وہیں ڈھیر ہوئے اور امیر منہ پر چھینٹا مار کر رسی کی گانٹھ کھول کر کنارے کنارے جنگل کی راہ سے دہلی کی طرف بھاگ نکلے۔

اس بربادی کا نہایت دردناک مرثیہ انھوں نے دہلی پہنچتے پہنچتے لکھ لیا اور آتے ہی غمزدہ بلبن کو سنایا، درباریوں نے سنا، فوجیوں نے اسے یاد کیا، مہینہ بھر تک کیمپ اور دربار میں دُہرایا گیا اور جا بجا مجلس ماتم بپا ہوتی رہی۔ گھر گھر ان کا دلدوز کلام پہنچا اور خسرو کی شاعری نئے رنگ میں گوش آشنا ہوئی۔[۲۹]

بلبن اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور سلطان محمد (شہید) کے بیٹے کی تخت نشینی کی وصیت کر کے سال بھر کے اندر ہی ۱۲۸۶ء میں دنیا سے اٹھ گیا۔

خسرو تقریباً دو سال سیاسی ہنگاموں سے دور ماں اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔ تاہم دہلی کے درباری حالات پر ان کی نظر رہتی تھی۔ امرا نے سازش کر کے بغرا خاں کے بڑے بیٹے

معزالدین کیقباد کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے کینہ پرور اور سازشی مشیر کار ملک نظام الدین سے خسرو کا دل نہیں ملتا تھا۔ اس سے کترائے رہے اور بالآخر اپنے وقت کے تیسرے لکھ لُٹ قدردانِ علم وادب امیر علی سرجاندار حاتم خاں (گورنر اودھ) کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔

بنگال تک خبریں گئیں۔ باپ، بغراخاں نے سنا کہ نوجوان بیٹے نے تخت پر بیٹھتے ہی دادا کے سارے طور طریق، ڈسپلن، سخت گیری کو اُلٹ دیا اور رنگ چلنی اور بیدار مغز سیاست کا راستہ چھوڑ دیا ہے تو بہار بنگال سے بڑی فوج لے کر آگے بڑھا، ادھر سے مقابلے کے لئے دہلی کی شاہی فوج چلی۔ اجودھیا میں دریائے گھاگھرا اور سرجو کے سنگم پر آمنا سامنا ہوا اور وزیر نظام الملک کی تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود باپ بیٹے میں صلح صفائی ہوگئی۔ بغراخاں نے اپنے صاحب تاج و تخت بیٹے کو عین وہی نصیحتیں کیں جو صرف سات سال پہلے فرماں روائے ہند باپ نے اسے اڑیسہ اور بنگال کا انتظام سونپتے وقت کی تھیں۔ (۳)

حاتم خاں اس علاقے کا گورنر تھا ہی، نوجوان بادشاہ کی واپسی پر وہیں اودھ (اجودھیا فیض آباد) میں رہ گیا۔ خسرو بھی روک لیے گئے۔

اس حاتم خاں نے داد و دہش کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ "فراق نامہ" اور "فرس نامہ" جیسی یادگار اور خطابیہ مثنویوں کے علاوہ (جن میں اودھ کی جی بھر کے تعریف کی گئی ہے) جتنا کلام اس حاتم وقت کی مدح میں ملتا ہے وہ یہ بتانے کو کافی ہے کہ ان کو طشت "(کشتیٔ زر)" بھر بھر کراتنی رقم ملی کہ اگر وہ کفایت سے، اوروں کو کھلا پلا کر بھی خرچ کرتے تو اولاد کے آخری وقت تک پوری پڑتی مگر وہ خود بھی خاتم الشعرا نہ سہی، حاتم الشعرا ضرور تھے۔ (۴)

دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا کے بعد اودھی بول چال کا یہ علاقہ، رام بھگتی کی سرزمین اپنی لوچدار تہذیب، خوش حالی اور نزاکت و نفاست کی بدولت انھیں پسند آیا، مگر وہ زیادہ دیر تک دہلی سے بے تعلق نہیں رہنا چاہتے تھے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ والدہ کی جدائی ستا رہی تھی، یہ بھی ہوگا، لیکن ایک سبب اور بھی تھا: نوجوان اور شوقین بادشاہ کی من موجی طبیعت، آزادہ روی، عطا کا جذبہ، خزانے کا بھرا ہونا اور دربار کا ملک الشعرا سے خالی رہنا۔

دہلی دربار میں

حاتم خاں نے روکنا چاہا، انھوں نے جانے کی ضد کی تو اودھ سے دہلی، ایک مہینے کا سفر خرچ اشرفی بھرے دو تھال دے کر رخصت کیا۔ یہاں پہنچے ابھی دو دن گزرے تھے کہ بادشاہ نے بلا بھیجا اور فرمائش کی کہ باپ بیٹے کی ملاقات، جو خون ریز جنگ کے بجائے شفقت و محبت میں بدل گئی، ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کے وہ خود عینی گواہ ہیں اگر نظم کر دیں تو "صلے میں اتنا زر دینے کو تیار ہوں کہ عمر بھر کوئی احتیاج نہ رہے"۔

"مہر زر" (شاہی اشرفی) اور "خلعت شاہی" سے ہاتھ کے ہاتھ اس پروجیکٹ کی مہورت بھی کر دی گئی۔

وہ تب تک اسی دن کے آرزو مند تھے؛ خوش خوش گھر آئے۔ دوستوں، عزیزوں یہاں تک کہ "جن وانس" سے روپوش ہو کر اعتکاف کیا اور پورے چھ مہینے بعد رمضان ۶۸۸ھ (۱۲۸۸ء) کے آخر میں ۳۹۴۴ شعروں کی مثنوی "قران السعدین" مکمل کر کے اور نقل کرا کے پیش کر دی۔

یہ مثنوی ان کی تمام تصانیف میں کئی (خصوصاً فنی اور سماجی) حیثیتوں سے نہایت اہم ہے۔ اب وہ ۳۶ برس کے آزمودہ، جہاں دیدہ، پختہ کار شاعر بھی ہیں، اپنی برسوں کی مراد کو پہنچے ہیں، دربار میں کوئی شاعر ان کا مد مقابل نہیں۔ اور انھیں اپنے فن کی بلند قدر و قیمت کا پورا احساس بھی ہے[۴]۔ یہی وقت ہے کہ ہم ان سے مل لیں۔

شاعر کی قیاسی تصویر

خسرو اپنی مثنوی "قران السعدین" پیش کرنے شاہی دربار چلے ہیں۔ مثنوی کا زریں بستہ خادم کی بغل میں ہے۔ آگے پیچھے دو دو خادم ہیں۔ درازی مائل قد، چوڑا سینہ، گردن کشیدہ، پیشانی کشادہ، منھ پر ڈاڑھی، جو نہ گھنی ہے فقیہوں کی طرح، نہ نکیلی یا چھدری ہے منگولوں تاتاریوں جیسی؛ رنگ سانولا، جو پچھلے چند برسوں میں جابجا کی خاک چھان کر اور بھی سنولا گیا ہے۔ آنکھیں روشن، مگر ذرا بھوؤں کے اندر بھنچی ہوئی۔ گوشۂ چشم میں ہلکی سی شوخی یا بذلہ سنجی کی جھلک، چہرہ باوقار شائستہ

کسے ہوئے ۔ امیرانہ پوز ۔ گھٹنوں تک قبا جس کی گوٹ زرتار اور منقش ہے اور کپڑا بنگال کا "نارک، نفیس اور باریک قبا کے اندر سے کمر کا پٹکا جھلکتا ہوا؛ سر پر صافہ اور عمامہ کی ملی جلی شکل والی دستار، جس کا ایک سرا گردن پر لٹکتا ہے۔ گھٹنوں سے نیچے ریشمی مخروطی ازار (شلوار) جو بے ایڑی کے سنہرے جوتوں (موروں) کو چھوتی اور ٹخنوں کو ڈھک لیتی ہے ۔ دامن اور پہلو سے عطر کی بھینی مہک آرہی ہے ۔ اپنی ننھیال کی شاندار حویلی سے دربار تک پہنچنے میں گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھتے اور کسی قدر جھک کر، مسکرا کر سلام جواب دیتے جاتے ہیں ۔ مسکراہٹ کے ساتھ چہرے پر بے تکلفی کی ایک ایسی لہر آتی ہے جس میں ان کے چمکیلے دانت اور پتلے ہونٹ مسواک کے باوجود ہونٹوں پر پان کا لاکھا، دکھائی دے جاتے ہیں ۔

ایک تو خسرو کے فن کی شوخی، پھر مثنوی ایسی کہ تب تک رزم، بزم، تاریخی تفصیلات، اندرخانہ، شہری زندگی، فنون اور صنعتوں حرفتوں کا ایک ایسا مرصع اور مکمل نقشہ کبھی کسی نے نہ کھینچا تھا ۔ اہل دربار اور خود بادشاہ عش عش کر گئے ۔ معزالدین کیقباد کو ان دنوں ویسے ہی اپنی تازہ فتح پر (جو منگولوں کے ایک دستے پر نصیب ہوئی تھی) ناز تھا ۔ پھر دادا اور نانا دونوں طرف سے بادشاہ زادہ عیش پسند اور آئندہ کی تاریخ میں اپنا نام ثبت کرانے کا آرزومند ۔۔ اس نے جی کھول کر داد بھی دی، زر و سیم بھی ۔ اس کے چچا نے شاعر کو ملتان لے جا کر مصحف دار (کتاب خواں اور شاہی لائبریرین) بنایا تھا، باپ نے محض ندیم اور قصیدہ گو ۔ معزالدین نے ان دونوں سے بلند مقام دیا ملک الشعرا کا درجہ مگر شاعر، جسے ڈھیر سا "پیل بار" سونا چاندی ملنے کی توقع تھی، بظاہر مسکراتا ۔۔ بباطن پیچ و تاب کھاتا ہوا آیا :

'کوئی میرے کلام کی کی قیمت کیا دے گا بھلا؟ یہ تو محض کاغذ کے دام ہیں!' (۲۳)

امیر نے ایک بار نظر اٹھا کر "چہرۂ مبارک" کی عیاش تھکن سے بھانپ لیا ہو گا کہ عنقریب اس تخت پر کوئی اور براجے گا ۔ وہ کوئی اور "ایک عمر رسیدہ، بے باک، نرم دل، بے لوث خلجی امیر فیروز تھا جسے مخدوش اور بہلوک نظام الدین وزیر کی جگہ، سامانہ سے بلا کر شائستہ خاں کا خطاب، برن (بلند شہر) کی جاگیر اور خسرو کے مرحوم نانا کا عہدہ" عارض ممالک"

دے دیا۔ امیر خسرو نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا اور یوں گویا مستقبل کی راہ ہموار کرلی۔

سال نہ گزرا تھا کہ معز الدین کیقباد کے خلاف منشا اور ترک امرا کے منصوبوں کو شکست دیکر ستر برس کا دہی خلجی امیر فیروز شاہی لقب جلال الدین اختیار کرکے بہاپور (موجودہ نئی دہلی) سے بادشاہی قصر کیلوکھری میں آیا۔[۴۴] بلبن کے عہد میں شاہی چتر سیاہ ہوا کرتا تھا، پھر وہ سُرخ ہوا، سادگی پسند جلال الدین نے چتر سفید کو شاہی علامت قرار دیا اور زندگی بھر ادب کے مارے بلبن کی تختگاہ پر قدم نہیں رکھا۔

خلجی افغانوں کے تیس سال

غوریوں کی طرح خلجی بھی افغان تھے[۴۵] لیکن وہ افغان جن کا خون سلجوقی ترکوں میں ملا ہوا تھا۔ ترکوں اور افغانوں کی پرانی کشمکش نے پھر زور پکڑا۔ بادشاہ اس عمر میں بھی رنگیلا تھا اور دربار میں رئیسانہ جشن منانے سے نہیں جھجکتا تھا، لیکن زمانہ پرآفات پایا۔ ساڑھے تین برس جنگ و جدل میں گزرے۔ اس نے انھیں ملک الشعرا تو نہیں بنایا البتہ مصحف داری کے عہدے پر امیر کا آبائی خطاب بحال کیا اور آبائی تنخواہ بارہ سو روپے (تنکہ) سالانہ مقرر کردی[۴۶]۔ امیر نے اس کی تخت نشینی پر یاد دلایا کہ میں آپ کا قدیم مدّاح اور آپ کی حکومت کا آرزومند رہا ہوں۔ تاہم جلال الدین کے دربار میں انھیں ایک مقررہ تنخواہ، کبھی کبھی کے انعام اور باادب کھڑے رہنے کی جگہ سے زیادہ کچھ نہ ملا۔

معلوم نہیں امیر خسرو کی شادی کب اور کہاں ہوئی لیکن (۶۸۹ھ) ۱۲۹۰ء میں ان کے ہاں پہلا بیٹا تولد ہوا اور اس کا نام مسعود رکھا گیا۔ قیاس کہتا ہے کہ کیقباد کے آخری برس انھوں نے اپنا گھر بسایا۔

جلال الدین فیروز خلجی کو اس تھوڑی سی مدت میں تین جنگوں سے سابقہ پڑا۔ خسرو کے دو سابق ممدوح ملک کشلو خاں (عرف ملک چھجّو) گورنر کڑہ اور امیر علی حاتم خاں (گورنر اودھ) یکے بعد دیگرے مقامی نادہندہ راجاؤں اور غیر مسلم جنگجو زمینداروں کو ساتھ ملا کر نہ صرف بغاوت پر آمادہ ہوئے بلکہ فوج لے کر بدایوں تک چڑھ آئے۔

دوسری تاریخی مثنوی اور مصلحت کا تقاضا

ان دونوں کی مدح میں خسرو کے قصائد ابھی تازہ تھے کہ انھوں نے جلال الدین فیروز کو خوش رکھنے کے لئے دونوں ترک امیروں کو برے لفظوں سے یاد کیا"[۴] وہ کڑہ (مانک پور) کی فوجی مہم میں بادشاہ کے ساتھ بھی گئے۔ بعد میں راجپوتوں کے مضبوط قلعے جھائن[۴۹] رنتھمبور کی فوجی مہم میں ساتھ تھے۔ انہی کی یادگار میں بادشاہ کی جنگی مہموں پر غالباً اسی کے ایما پر ایک مختصر سی مثنوی مفتاح الفتوح بھی لکھی، جس کے شروع میں ہی جتا دیا ہے کہ میں واقعات کے نظم کرنے میں غلط بیانی اور مبالغے سے کام نہ لوں گا۔ خود یہ بادشاہ بھی اسی طبیعت کا آدمی تھا۔

ابھی وہ راجپوتانے کی مہم سے واپس ہوا تھا، دم لینے نہ پایا تھا کہ ایک زبردست منگول تاتار فوج سنام اور ملتان کی سرحد پر گھنگھور گھٹا کی طرح امنڈی، ارکلی خان کمانڈر اس مہم پر روانہ ہوا۔ بادشاہ خود بھی منگولوں سے مقابلے کا بڑا شائق اور عادی تھا، لیکن وہ پایۂ تخت سے گیا نہیں۔ امیر خسرو بھی یہیں رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چنگیز کے بیٹے چغتائی قاآن (خان)، کے ایک فرزند ترمہ شیریں والی شاخ جو ماوراء النہر پر قابض تھی، ۴۰-۵۰ سال کے رابطے کے بعد اب اسلام کی طرف مائل ہوتی جا رہی تھی"[۵۰] اس نے قسمت آزمائی کے لئے یہ داؤ چلا کہ پوری قوت سے ہندستان پر حملہ کیا جائے۔ اگر افغانوں اور ترکوں کے نفاق میں بوڑھے بادشاہ کا سنگھاسن ڈول گیا تو دو نسلوں کی منگول تاتار مراد برآئے گی، اگر ناکامی ہوئی تو وہیں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے رہ پڑیں گے، بالآخر سیاسی طاقت میں شریک ہو جائیں گے۔ ایک معاصر تاریخ میں ڈیڑھ لاکھ کے اس لشکر جرار کے سالار کا نام عبداللہ دیا گیا ہے، دوسری جگہ الغ خاں ـــ دونوں بہرحال ہولاگو (ہلاکو) کے پوتے تھے اور ابھی تک کہیں اپنا گڑھ نہیں بنا سکے تھے "چند روز مبارز طرفین جنگ میں مشغول رہے اور ایک جماعت کثیر قتل ہوئی ..... مغل بے شمار علف تیغ خوں آشام ہوئے ...." جنگی معرکے کے بجائے گفت و شنید شروع ہو گئی ..... بادشاہ نے ان کے سردار کو، جو قرابت ہلاکو خاں سے رکھتا تھا،" اپنی زبان مبارک سے فرزند فرمایا، اس نے بادشاہ کو پدر کہا ...."[۵۰]

بادشاہ نے ان کو انعام اکرام، جیب خرچ، تحفے تحائف دے کر رخصت کیا، جورہ پڑنا چاہتے تھے، لاہور شہر اور دہلی کے مضافات میں بسنے کی جگہ دکھادی۔ یہی محلّے بعد میں مغل پورے کہلائے۔

امیر خسرو کے ہاں اس واقعے کا ذکر سرسری ہے، لیکن جب ان میں سے کئی ہزار کو عہد علائی اور مبارک شاہی میں قتل کیا گیا تو امیر خوش ہوئے ہیں(۵)۔۔ اور یہ تنہا موقع ہے جب وہ قتل عام پر علانیہ یا در پردہ بیزاری کا اعلان نہیں کرتے۔

شاعری کا شباب چالیس برس گزرنے پر

خسرو دو سال جم کر دہلی میں بیٹھے، اسی زمانے میں خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ پر آمد و رفت بڑھی۔ انہی دنوں اپنا سب سے اہم دیوان "غرۃ الکمال" صاحب نظر اور بزرگ دوستوں، مولانا شہاب الدین قاضی سراج، تاج الدین زاہد اور علاء الدین علی شاہ کے مشورے اور مدد سے ترتیب دیا۔ بعد میں ایک تفصیلی دیباچہ بڑھایا جس میں اپنی سوانح حیات کے علاوہ شاعری کے متعلق عموماً اور اپنے رنگِ سخن پر خصوصاً روشنی ڈالی ہے۔ یہ پہلا دیوان تھا جس پر "شیخ الشیوخ عالم" نظام الدین "کی مدح" خدا اور رسول کے فوراً بعد اور بادشاہ کی مدح سے پہلے آتی ہے۔ یہ تیسرا دیوان ہے مگر پہلے دو کی طرح اس میں بھی غزلیں شامل نہیں کیں اور دیباچے کے خاتمے پر اپنے بدلے ہوئے موڈ کی فکری پرچھائیں یوں ڈالی:

"افسوس، صد افسوس کہ" ان چند شعبدوں میں، جھوٹ کی اس پوٹ میں اپنی عمر کے نفیس ترین سانس خالی کر دیے۔ اور عمر عزیز ان پر ضائع کر دی شعر سے میرے ہاتھ وہی آیا جو گرد و غبار سے آدمی کی مٹھی میں آتا ہے۔ اس خبط کے مارے اندھیرے میں تکے بہت سے چلائے۔ اب چاہوں کہ ہاتھ دھولوں، (دامن پاک کرلوں) تو بس ہوا سے ہاتھ بھی نہیں دھو سکتا۔ یہ محض دل کے ارمان تھے" کہ سخن نام بر بندہ فرض است "۔۔۔۔ کفر و زندقہ میں اتنی فکر (یعنی فکر سخن) صرف کر دی۔ اسے کسی اچھے کام میں لگانا چاہیے

نہاں" یعنی درعالم وحدانیت مصروف شدے ......"

اب تک انھوں نے کیریر اور امارت کی تلاش کی، طشتِ زر کی امید رکھی، شاعرانہ مقبولیت چاہی، غزلیں لہک لہک کر سنائیں، دھنیں بنائیں اور خوش آواز گانے والوں اور گانے والیوں کو تربیت دے کر سنیں اور سنوائیں، گیت سنگیت، ناچ رنگ، جام و دلارام کی محفلوں میں جی بھر کے رتجگے کیے، سفر کیے، کنیزیں رکھیں، زبان، قلم اور تلوار تینوں کی تیزی منوائی، میدانوں اور جنگلوں کی چلچلاتی دھوپ، رَن میں بجتے کھانڈے اور چھنکتے جام و پازیب، کہیں سے منھ نہیں پھیرا اور اب عمر کے چالیس سال پورے کر کے وہ ماضی کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں[۵۵]۔ مگر ایک ہی سانس میں پورا موہرکا ٹنا ان کے سے مزاج اور تاریخی حالات کو منظور نہ تھا۔

بوڑھے، خوش مزاج جلال الدین خلجی کے ہاں اپنے پیش رو ترک نوجوان معزالدین کیقباد کی طرح دوست، دشمن سب کو ڈھیل تھی ڈیڑھ سال اور گزر گیا کسی طرف سے فتنہ یا شورش کا خطرہ نہ رہا۔

اس درمیان میں اولوالعزم، منچلے اور اپنی کامیابی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والے بھتیجے اور داماد، علی گرشاسپ علاءالدین نے دبے پاؤں دکن کی طرف دیوگری پر چڑھائی کی اور صدیوں کی جمع پونجی میں اپنا حصہ بٹا لیا۔ وہاں سے واپسی پر حیلوں تدبیروں سے کڑہ [مانک پور] کے مقام پر، گنگا کنارے جہاں علاءالدین نے بادشاہ کے پرانے باغی ملا لیے تھے، باپ جیسے مشفق سلطان کو بلا کر قتل کر دیا۔ رمضان ۶۹۵ھ کی سولھویں[۱۶] تاریخ تھی اور بدھ کا دن (۱۹ر جولائی ۱۲۹۶ء) جلال الدین فیروز کے خونِ ناحق سے نمٹ کر جب وہ منزل بمنزل دہلی کی طرف مِن برساتا، گو پھنوں سے روپے اشرفی کا بکھیرتا ہوا چلا تو تیس برس کا کڑیل جوان، دکن کا پہلا فاتح افغان اپنوں اور غیروں کے لئے امید گاہ بن گیا اور دشمنوں اور نکتہ چینوں کے لئے سیلاب بے پناہ' بقول شخصے دیوگری میں علاءالدین نے دہلی فتح کر لیا[۵۶]۔

سیاسی جبر اور سماجی تہذیبی اختیار کی پالیسی

علاءالدین نے اپنے سے پہلے کے دس سال، معزالدین کیقباد اور فیروز خلجی کا دور گویا تاریخ ہند سے بالکل نظر انداز کر کے بلبن کی سخت گیر، بے لوچ، منصفانہ، غیر شاعرانہ مگر انتظامی

سخت گیر پالیسی اپنائی، اُسے آگے تک پھیلایا، فرق یہ کہ بلبن بیس برس مرکز کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھا رہا تھا، مگر علاء الدین نے دیوگری کی آسان فتوحات میں سونے کی کانیں دیکھ لی تھیں تو وہ ایک مضبوط مرکز کا دائرۂ اختیار زمین کے چپّے چپّے پر پھیلانے کا آرزو مند تھا۔ کتاب کی معمولی شُد بُد رکھنے والے اس حوصلہ مند بادشاہ کو جس نے ترک امیروں کے باہمی اختلافات سے فیض اٹھایا بھی اور انھیں امید و بیم کی حالت میں رکھ کر فیض پہنچایا بھی ۔ سکندر کی طرح فاتح اعظم بننے کی تمنا تھی ۔ خود کو وہ "سکندر ثانی" کہلانا پسند کرتا تھا۔ امیر خسرو نے جابجا اسی خطاب سے یاد کیا ہے ۔

امیر خسرو نے اِس بدلے ہوئے سیاسی موسم میں اپنے شاعرانہ مرتبے کا مستقبل تو دیکھ لیا اور اس سے منسوب کر کے کسی عظیم مثنوی کی تصنیف کا خیال دل سے نکال دیا، تاہم ان کی رگوں میں آباؤ اجداد کے جنگجو خون کی گردش بڑھ گئی۔ جلوس کے اگلے ہی سال (۹۸-۱۲۹۷ء) وسط ایشیا سے ایک لاکھ منگول، تاتار، اور چینیوں کا[55] زبردست لشکر پے در پے دریائے جہلم پار کر کے پائے تخت کی طرف بڑھا اور اسے ظفر خاں اور الغ خاں نے شکست فاش دی، دوسری بار خود علاء الدین اپنے کمانڈروں کو لے کر نکلا اور فتح مند لوٹا، بیس ہزار منگول مارے گئے، ہزاروں افسر اور فوجی پابہ زنجیر شہر شہر گھمائے گئے، ہاتھی کے پاؤں تلے روندے گئے تو امیر خسرو کا جی ٹھنڈا ہو گیا۔ انھیں ملتان کی بربادی کی یاد رہ رہ کر ستایا کرتی تھی ۔

ہُدہُدِ سلیمانی

علاء الدین نے تین سال کے دوران منگول تاتار اور چینی فوج کے لگاتار پانچ اور ایک سے ایک زیادہ خوفناک حملوں کو اس قوت کے ساتھ کچلا کہ دلوں سے منگول یلغار کی دہشت دور ہو گئی اور مرکز کو شمالی سرحد کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

امیر خسرو کا درباری منصب اور دبدبہ قائم رہا، اس متحرک اور بے چین طبیعت کا ایک حال پر قائم اور مطمئن رہنا دشوار تھا۔ شروع میں تو بادشاہ خود جہاں لاؤ لشکر لے جاتا، انھیں بھی ساتھ جانا پڑتا "ورنہ بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ میرا ہُدہُد کہاں ہے" اور ہُدہُد سے کوئی عذر بن نہ پڑے تو اسے غائب پاکر وہ عذاب میں مبتلا کرے[56]۔ مگر یہ سلیمان وقت اپنے

بُدبُد سے بے نیاز تھا۔ اس نے جیتے جی شاعر سے کسی تاریخی کارنامے کی فرمائش نہیں کی ۔

خمسہ "بلند مینار پر کمند

راجپوتانے کی لمبی فوجی مہم کے بعد تیرھویں صدی کے آخری تین سال وہ پائے تخت میں جم کر بیٹھے۔ اب انھیں تکمیلِ فن کے علاوہ ایک فکر اَور تھی ۔ فارسی کے عالمی ادب میں ایران توران کی ٹکسال میں اپنی قیمت آنکنے اور اپنا سکہ چلانے کی فکر۔ فردوسی کے بعد اگر کسی نے مثنوی میں کمال دکھایا، بیان کے فن کو نغماتی سانچے میں ڈھالا اور سب سے اہم یہ کہ شاہانِ وقت کو قصہ کہانی کے رُوپ میں اخلاقی سبق حلوے کا لقمہ بنا کر دیے تو نظامی گنجوی نے ۔ وہ ایک عدیم المثال نمونہ سامنے تھا اور امیر اس کے شاعرانہ کمال کے قائل بھی تھے ۔ انھوں نے اسی مینار پر کمند پھینکا۔ نظامی دنیاداری کے جھنجھٹ سے الگ، دامن میں پاؤں کھینچ کر کوہ صفت بھاری شخصیت کے ساتھ ایک جگہ (گنجہ میں) جم رہے، تب ۳۴ برس (۵۷۲ ھ سے ۵۹۹ ھ) میں پانچ مثنویوں کا ایک خمسہ بادشاہوں کو نذر کر کے اور ان سے نذرانے کر دنیا کے آگے پیش کیا۔ خسرو نے یہ کام تین سال میں کر ڈالا (۱۲۹۸ء - ۱۳۰۱ء) وہ بھی روز کے معمولات اور دربار کی حاضری بجا لا کر۔ یکے بعد دیگرے پانچ مثنویاں اپنے روحانی مرشد خواجہ نظام الدین کی محبت اور عقیدت کا اعلان کرتی ہوئی بلکہ انہی کی نذر۔ اب جا کر یہ رشتہ استوار ہوا تھا اور اس نے روحانی، فکری اور فنی قوت کا ایک تازہ سرچشمہ کھولنا شروع کیا، سکونِ قلب بھی دیا اور وقت میں برکت بھی ۔

سلطان جی، نظام الدین خواجہ

دلوں کے بادشاہ، درویشوں کے درویش، چشتی سلسلے کے چوتھے پیر[۵۷] اور دن بھر روزہ رکھنے پر بھی جوانوں کے جوان خواجہ نظام الدین خسرو سے عمر میں کوئی ۱۹ برس بڑے تھے خسرو نے غالباً پہلی بار اپنے نانا کی ڈیوڑھی پر رہنے والے ایک نوجوان عالم کے حلیے میں انھیں دیکھا تھا۔ وہاں سے وہ اٹھائے گئے۔ پھر نظام سے بڑھ کر نظام الدین اور پھر خواجہ، شیخ اور صاحب مقام، پیر خانقاہ ہوئے۔ امیر خسرو کا ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ ان کی مقناطیسی نظر کے تار میں

بندھتے گئے۔ خواجہ اب ہر طرح کی آزمائشوں سے ثابت قدم گزر چکے تھے، خسرو کی شخصیت اور شاعری کے دلدادہ تھے، ان کا کلام انہی کی زبانی سننے اور داد دینے کے عادی تھے۔ مگر اب خسرو اُن کے فقیری دربار میں حاجت مند کی طرح پہنچے تو عالم ہی کچھ اور ہوگیا۔ قربت و خلوت کے جس مقام پر روز کے آنے والے بلکہ سچے مرید نہ پہنچے تھے، خسرو وہاں پہنچ گئے اور دن بھر کی روداد مزے مزے میں سنانے لگے۔ سعدی کی غزلیں اور نظامی کی مثنویاں نوک زبان تھیں۔ لے اور ترنم میں دُہراتے تھے۔ نظامی کی مثنویاں نظام الدین کو سناتے سناتے خسرو خود دل و جان سے "نظامی" ہوگئے۔ اس عشق کا اسرار بیان کرنا دشوار ہے، تاہم اس کی توجیہ پروفیسر محمد حبیب سے بہتر کسی نے نہیں کی:

"...... دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود رشتۂ الفت بہت مضبوط تھا۔ خسرو کی ساری زندگی اگرچہ درباری فضا میں کٹی تھی، مگر ان کا قلبی رجحان تصوف کی طرف تھا۔ دوسری طرف شیخ جو خود بھی اکثر اعلیٰ پایہ کی رباعیاں کہا کرتے تھے خسرو کی گرمیٔ کلام پر جو ان کی ترکی نژادی کا نتیجہ تھی فریفتہ ہوگئے۔ جوانی کی امنگوں کے ختم ہوتے ہی خسرو میں پارسائی و ارادتمندی آگئی۔ اور شیخ نے جن کی رواداری غیر محدود تھی، اس درباری کو خوش آمدید کہا، خانقاہ کی ساکن فضا میں، ان کے آنے سے، ایک مختلف دنیا کی نسیم خوشگوار آئی ...... دوسری طرف خسرو کو شیخ کی روحانی ضیا باری اور عظمت نے مسخر کرلیا تھا۔ خسرو کو زندگی بھر ایک تمنا رہی جس نے ان کو بے تاب رکھا۔ وہ یہ کہ قلم سے کوئی ایسا شاہکار نکل جائے جو ان کو زندہ جاوید بنادے۔ مگر یہاں اگر ایسے شخص سے ملے جو دنیاوی حسرتوں سے پرے نکل چکا تھا اور جس کی تعلیمات نے ان کو بتادیا کہ روح کی باطنی تعمیر دنیاوی کارناموں سے اعلیٰ وارفع ہے۔ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ اتنا اہم نہیں جتنا کہ وہ خود بن جاتا ہے۔ انسان کی روح کی قیمت اس کی ذاتی خوبیوں سے لگائی جاتی ہے۔ خسرو نے اپنے نصب العین کو نہیں چھوڑا لیکن ان کی ہزاروں مترنم غزلیں، انکی اس قوت اور مسرت کا ثبوت دیتی ہیں جو اس نقطۂ نظر نگاہ نے پیدا کردیا تھا[۵] ..."

خمسے کے موضوعات اور شاعرانہ حیثیت

"مطلع الانوار"، تصوف و اخلاقیات کے موضوع پر تھی، کچھ خشک رہی۔ "شیریں و خسرو" میں پورا ڈرامہ تھا، ۴ کردار۔ شہزادہ، شہزادی، نوجوان انجنیئر عاشق ناکام۔ خسرو نے اس میں اپنا رنگ طبیعت زیادہ کامیابی سے دکھایا، اور اسے پھیلایا بھی خوب۔ جب تیسری مثنوی "مجنون و لیلیٰ" لکھ رہے تھے (۱۲۹۹ء) بہن، ماں اور چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ مثنوی میں جہاں دردِ الفت یا غم فرقت کا بیان آگیا، شاعر پر ایسی رقت طاری ہوئی ہے کہ عجب نہیں جو کاغذ پر آنکھیں نہیں، آنسو ٹپکائے ہوں۔ چوتھی "آئینہ سکندری" نظامی گنجوی کی دونوں مثنویوں (سکندر نامہ برّی و بحری) کا سامنا کرتی ہے اور ہے بھی ان دونوں سے مختصر۔ لیکن اُن کی پانچویں "ہشت بہشت" واقعی بے مثل، رواں دواں، خوشگوار اور گہری مثنوی ہے۔ علامۂ دہر[۵۹] مولانا جامی (متوفی ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) جنھوں نے ایک جملے میں دوٹوک فیصلہ دیا تھا کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، انھوں نے اسی راہ کو اپنایا۔ مگر ہشت بہشت کے مضامین اور طرز بیان سے کترا کر) دنیا میں آج اسی مثنوی کے مصوّر نسخے زیادہ ملتے ہیں اور ایسے کہ آنکھیں روشن ہوجائیں۔ یہاں نہ حاشیہ آرائی کی ضرورت تھی، نہ مدح سرائی کی؛ بیان کیے ہوئے افسانوں کو، انھی یا دوسری تفصیلات یا ترمیم و اختصار کے ساتھ اپنے رنگ سخن میں ڈھالنا اور تازگی بخشنا شاعر کا کام تھا، عام پسند غزل گوئی سے کہیں زیادہ دشوار۔ اٹھارہ ہزار اشعار کے جوابی خمسے کی گونج ہوئی۔ سو برس آگے نظامی ہیں، سو برس پیچھے جامی اور نوائی۔ ہندستان سے باہر کی دنیا نے خمسے کے میدان میں ان کا لوہا مانا۔ البتہ ہندستان میں خسرو کا نام تاریخی مثنویوں نے دو ہوں، گیتوں اور غزلوں نے پھیلایا جو محفل سماع کی جان تھیں۔[۶۰]

سیاسی سماجی تاریخ اور شاعری

ہم پھر اُن کے کفایت شعار ممدوح کی طرف آتے ہیں: علاء الدین خلجی نے اندرونِ ملک پہلی مہم گجرات کو بھیجی جہاں سے سمندر کے مغربی کنارے تک ہر جگہ فتح ہوتی چلی گئی۔ اسی فتح میں راجہ کرن کی رانی کنولا دیوی اور ایک سیاہ فام لڑکا مانک[۶۱] دیو چلپنا پرزہ، دلیر ملک مانک قیدی بنا کر لائے گئے۔ یہی مانک عظیم الشان سپہ سالار

اور ڈپلومیٹ ملک کافور کے نام سے تاریخ ہند میں اَمٹ نشان چھوڑ گیا؛ رانی کنولادیوی نے اپنی فرقت زدہ کمسن بیٹی دیول دی کو پاس بلوانے کی جو ضد کی وہ بعد میں رنگ لائی ۔ اور اسی کے واقعا پر امیر خسرو کا بہترین شعری کارنامہ مثنوی "دَوَل رانی خضر خاں" مبنی ہے ۔

گجرات کی پہلی فوجی مہم میں ایک تنومند لڑکا اور گرفتار ہوا جو "براوو" ذات کے جنگی قبیلے سے تھا ۔ اس نے قبول اسلام کرکے اوّل حسن نام پھر خسرو خاں لقب اختیار کیا ۔ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ علاء الدین کے خاندان کا چراغ گل کرنے میں گجرات کے ان تینوں "قیدیوں" کا ہاتھ ہے"[۶۲] اگرچہ یہ تینوں قیدی سماج کی الگ الگ پرتوں سے آئے تھے ، لیکن خلجی شاہی خاندان میں اعتبار اور اقتدار حاصل کرکے انھوں نے واقعات کو وہ رخ دیا کہ جب ۱۳۲۱ء میں خسرو خاں کی شکست اور خاتمے کے بعد شاہی خاندان کے وارث کی تلاش ہوئی تو ڈھونڈھے سے کہیں نام و نشان نہ ملا اور غازی ملک تغلق کو مجبوراً تخت شاہی پر قدم رکھنا پڑا ۔

امیر خسرو ان تمام واقعات کے عینی گواہ ہیں ، لیکن یہ محض اتفاقی امر نہیں کہ علاء الدین جیسے اولوالعزم حکمراں پر انھوں نے کوئی تاریخی مثنوی خرچ نہیں کی ۔ وہ اس کی مدح تو جی جان سے کرتے ہیں ، مگر "کمال فن" کے اظہار میں پہل نہیں کرتے ۔ اُسے کسی اَوروں کے لئے اٹھا رکھتے ہیں ۔

حقیقت پسندی کی جانب

علاء الدین خلجی نے دغا اور دولت سے دہلی کی وسیع سلطنت قبضائی تھی ، اور پورے بیس سال اسے دلیری ، ہمت ، سخت گیری اور انتظامی قابلیت کے ساتھ چلایا[۶۳] اپنے "خمسہ" کی ہر ایک مثنوی میں امیر خسرو بڑھ چڑھ کر اس کی مدح کرتے ہیں ، کبھی براہ راست ، کبھی اَوروں پر رکھ کر نصیحتیں کرتے ہیں اور نظامی گنجوی کی طرح خود بھی "سکندر ثانی" علاء الدین والدنیا فاتح عالم ، نائب خلیفہ" سے صلہ ، انعام اور قدر دانی کی امید رکھتے ہیں ــــ لیکن سلطان نے ان کو اپنے دربار کی معمولی سی زینت اور خانقاہ نظامیہ سے ایک زندہ رابطہ بنائے رکھنے کے علاوہ کچھ اہمیت نہیں دی ۔ امیر نے قصائد لکھے ، اپنا منصبداری فریضہ پابندی سے انجام دیا مگر بالآخر سمجھ گئے کہ یہاں مبالغہ آرائی سے نہیں واقعہ نگاری سے ہی کام چلے گا ۔ اور وہ اپنے اس حقیقت پسند ممدوح

گے بارے میں خود بھی حقیقت پسند ہو گئے۔

عظیم الشان ہستیاں صرف تکلف، احتیاط اور اعتراف کے رشتے برت کر ہی ایک مقام پر رہ سکتی تھیں۔ اسی لئے امیر خسرو بار بار درخواست کرتے ہیں کہ انھیں "حاضری" سے مستثنیٰ کرکے شاعرانہ مصروفیت کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے"۔(۴۴)

امیر نے جا بجا علاء الدین کو اس کارنامے کی داد دی ہے کہ غلّے کے سرکاری گودام بھرے ہوئے ہیں، قحط کا خطرہ نہیں رہا، ضرورت کی تمام چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہو گیا ہے، ناپ اور ماپ میں دوکانداروں کی بے ایمانی کا خاتمہ کر دیا گیا،(۴۵) پتھر کے بجائے لوہے کے باٹ آگئے سازشی گروہ اور گروہی سازش، دونوں کا ناطقہ بند ہے۔ زمین کی لگان بندی، تنخواہوں اور اجرتوں کی معیار بندی سے زمینداروں اور پٹواریوں کا زور ٹوٹا۔ عوام میں خوش حالی ہے۔ چوری ڈکیتی کی نہ ضرورت رہی، نہ گنجائش۔ ساحل سندھ سے بنگال اور دھور سمندر (تامل ناڈو) تک راستے محفوظ ہیں، انصاف کا بول بالا اور حنفی شریعت کا حکم رواں ہے۔ شاہی لشکر نے منگول، تاتار اور چینی حملہ آوروں کو ایسی مہلک شکستیں دی ہیں کہ آئندہ وہ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے اور جنوب کے راجا یا تو باج گزار اور دوست ہو گئے یا ان کا زور ٹوٹ گیا۔

علاء الدین خلجی ان کے لئے محض ایک بادشاہ نہیں رہا بلکہ اولوالعزمی، پامردی، بے رحم انصاف اور زبردست وسیع سلطنت میں رعایا کے جان و مال کی حفاظت کا نشان بن گیا۔ وہ اس کی کفایت شعاری کو اوّل اوّل بخل سمجھے، کچھ کبیدہ خاطر رہے، پھر انھوں نے اس پالیسی کا ہندستان گیر اثر دیکھا، اُس کی قدر و قیمت جانی، اسے سراہا اور صرف قصیدوں میں، خمسہ کی مثنویوں کی تمہیدوں میں نہیں، بلکہ (عہدِ علائی کو بارہ برس جانچنے اور سمجھنے کے بعد) اپنے قلم کا پہلا نثری کارنامہ "خزائن الفتوح" لکھ کر پیش کر دیا۔ جو پیچیدار اور کسی حد تک مبالغہ آمیز استعاروں کے باوجود علاء الدین کے دور میں شمالی اور جنوبی فتوحات کے واقعات کی ایسی منہ بولتی تصویر تھی کہ اس کا نام ہی "تاریخ علائی" پڑ گیا۔

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کی اس طاقتور مرکزی سلطنت کے جبر و قہر،

شان وشکوہ، ناپ تول اور دور اندیشی کی تہہ میں اترنے کے لئے "خزائن الفتوح" کی تہہ دار نثر ایک زینے کا کام دیتی ہے۔ آج ہندستان کی کوئی ایسی معتبر تاریخ نہیں لکھی جاتی جس میں عہد علائی کے واقعات کی سند کے لئے امیر خسرو کی تصانیف، خصوصاً "خزائن" کو گواہ نہ بنایا گیا ہو۔

راجپوتانے کی جنگوں میں، جہاں جہاں بادشاہ بذات خود گیا، امیر خسرو ہمرکاب تھے، دکن کی فوجی مہموں میں (۱۱-۱۳۰۶) امیر خسرو نہیں گئے تھے لیکن انھوں نے ایک ایک تفصیل ریکارڈ کی۔ معاصر مورخوں سے زیادہ صداقت کے ساتھ فتوحات کی تاریخی اور سماجی اہمیت کو ابھارا۔

امیر خسرو کی زندگی میں ہندستان پر دس بار منگول حملے ہوئے۔ جن میں سے چار[۲۱] حملے، بلکہ جان توڑ حملے علاء الدین کے شروع پندرہ سال کے دوران ہوئے۔ آخری حملے میں دو لاکھ فوج تھی جس میں دو دو بار کے تجربہ کار منگول سپہ سالار (مثلاً ترغی) موجود تھے۔ دوبار دشمن دہلی کی فصیلوں تک آگیا۔ اور وہاں سے پسپا ہوا۔ امیر خسرو کے نزدیک ان فتوحات میں علاء الدین خلجی کی پالیسی، مردانگی اور طریق جنگ کے علاوہ حضرت نظام الدین کے دم کی برکت بھی شامل تھی۔ لیکن وہ "خزائن" میں یہ نہیں جتاتے۔

امیر خسرو کے نزدیک اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ امن کے زمانے میں غریب اور پست حال کسان زمینداروں اور صوبیداروں کی زبردستیوں سے محفوظ ہے اور جنگ کے زمانے میں لشکر کی گزرگاہ کے قریبیے، دیہات اور شہر لوٹ اور بے آبروئی سے محفوظ ہیں۔

ان کے نزدیک اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ جہاں گیری کے ساتھ جہاں بانی بھی ہے۔ بادشاہ اِس سرے سے اُس سرے تک ملک کو فتح کرنے کے علاوہ انتظام میں بھی کامیاب ہے۔

...... آں کہ بگیرد و نتواند داشت آں گرفت بروے گرفتہ بود،

وواجب است کہ جہانے بروے گرفت کند تا آواز آں گرفت جہاں گیرد[۲۲]

یہی خیال انھوں نے اپنی مثنویوں میں بھی ابھارا ہے بلکہ جتایا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ امیر اب دربار میں ایک مصحف دار اور منصبدار شاعر کی حیثیت سے نہیں، خود کو ایک سخت گیر مدبر کی حیثیت میں دیکھتے ہیں اور خالی خولی مدح سرائی کو فعل عبث شمار کرتے ہیں۔[۲۳]

مثنوی" مجنون ولیلی" انھوں نے ۱۲۹۹ء میں تمام کی ہے۔ یہ علاء الدین کا جنگی زمانہ ہے جب علماء اور مفتیوں کی زبانیں اس کے آگے بند تھیں۔ وہ مثنوی کے ختم پر بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں[٦٨]:

ترکانہ زمو گرہ کشائی — پیشہ مکنی ثنا سرائی
چوں من نشوی کہ ہر زمانے — سازم بدروغ داستانے

یعنی شاعری اور مدح سرائی پر بسر نہ کرنا، آبائی پیشے شمشیر زنی اور نشانہ بازی اختیار کرنا قوت بازو کی کمائی کھانا۔ انھیں معلوم ہے کہ مثنوی دوست اور دشمن سبھی تک پہنچے گی۔ شروع میں مدحیہ بیان ہے تو ممکن ہے علاء الدین پڑھوا کر سنے، پھر بھی کجکلاہانہ بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔

"..... مجھ جیسا "مسکین" حاجت مند، بے سروسامان، جو کھولتی ہوئی دیگ کی طرح تپ رہا ہے، رات سے صبح تک، صبح سے شام تک "گوشۂ غم" میں چین نہیں پاتا۔ خود غرضی کے ہاتھوں یہ ذلت اٹھاتا ہوں کہ اپنے جیسے ایک آدمی کے سامنے (ادب سے) کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ جب تک پاؤں سے سر کو خون نہیں چڑھ جاتا، کسی کے پانی (معاوضے یا اُجرت) سے میرا ہاتھ تر نہیں ہوتا"

یہ ہے موڑان کی زندگی اور تصورات کا، جو عہد علائی کی فتح مندی اور عہد قصیدہ گوئی کی شکست نے سازش کر کے انھیں سجھایا۔ اور جس کی بدولت "خمسہ" مکمل ہوا۔ بعد کی تاریخی اور اہم مثنویوں میں بیان واقعہ پر زیادہ زور دیا گیا، حضرت نظام الدین کے احوال جمع کیے گئے جو بعد میں اوروں کے قلم سے اَدل بَدل کر "افضل الفوائد" کی موجودہ صورت میں آئے[٦٩]۔ اور ضخیم نثری تصنیف" رسائل الاعجاز" نے تکمیل پائی۔

۵

علاء الدین کے حصے میں فتح و کامرانی کے ۲۰ سال آئے اور ۸۴ جنگیں اُسے پے در پے کئی غیر معمولی فتوحات بھی حاصل ہوئیں ان فتوحات میں ترکوں، افغانوں، نومسلم راجپوتوں اور اُن سورماؤں کا ہاتھ تھا جنھیں ذاتی قابلیت اور مختلف تدبیروں سے نیا نیا سیاسی اقتدار نصیب ہوا تھا۔ ملک کافور اور خسرو خاں اور اس کے ہم قبیلہ لوگ انھی میں شامل تھے۔ انھوں نے شاہی خاندان کا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آئندہ پانچ سال میں رفتہ رفتہ اسے بے دخل کر دیا۔ امیر خسرو ان امرا میں بعض کو ان کی مرکز سے وفاداری اور جاں نثاری کے سبب وقت آنے سے پہلے ہی "خوش" کر چکے تھے مگر جب ان کی نیتوں میں فتور دیکھا، ناخوش ہو گئے اور یہ ناخوشی انھوں نے موقع ملنے پر چھپائی بھی نہیں۔

۴۔ جنوری ۱۳۱۶ء (۶۔ شوال ۷۱۶ھ) کو جب علاء الدین کی آنکھ بند ہوئی اس سے ذرا پہلے ملک کے دور دراز علاقوں میں بغاوت یا شورش پھوٹ پڑی تھی۔ علاء الدین کے انتقال اور اس کے ناز پروردہ بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی (۱۸۔ اپریل ۱۳۱۶ء) کے درمیان پائے تخت میں کئی نشیب و فراز آئے۔ لیکن امیر خسرو خانہ نشین ہو کر "دول رانی خضر خاں" کی تصنیف میں مصروف رہے۔ خود کہتے ہیں کہ چار مہینے میں مثنوی تمام ہوئی۔ چار مہینے کی خانہ نشینی میں انھوں نے یکسوئی سے اپنا بہترین کارنامہ "دول رانی خضر خاں"

مکمل کیا۔ جہاں ان کی بیانیہ صلاحیت اور غنائی جوہر، دونوں یکجان ہو گئے ہیں۔

شہزادہ خضر خاں امیر خسرو کا قدرداں، خواجہ نظام الدین کے مرید کی حیثیت سے ان کا خواجہ تاش اور ولی عہد تھا، اس نے اپنی داستان عشق سنا کر، یادداشتیں حوالے کر کے اسے نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ فرمائش پر لکھ رہے تھے، چاہتے ہوں گے کہ بادشاہ کے آخری دنوں میں مکمل کریں۔ واقعات کا تفصیلی بیان بھی اس کی شہادت دیتا ہے، مگر حالات پلٹ گئے اور امیر خسرو نے مثنوی روک کر بعد کے حالات بھی، جو صاحب اختیار ملک کافور کے خلاف پڑتے تھے اس میں شامل کر لیے۔ یوں یہ مثنوی داستان عشق کے بجائے ایک سماجی تاریخی دستاویز بن گئی۔

وجود کی پیاس اور خواجہ کی درگاہ

خواجہ نظام الدین کی درگاہ پران کی روزانہ حاضری اور حلقہ ارادات میں مستقل شمولیت بھی ایک حد تک ذمہ دار ہوگی اس جرات کی جو غیر معمولی طور سے اس مثنوی پر حاوی ہے۔

شہ آنرا داں کہ گفت از جان آزاد	بترک بخل و خشم و لہو و بیداد
شہے کش چار ترکش در کلہ نیست	ببایدترک او گفتن کہ شہ نیست

ان اشعار کے پیچھے کونسا ذہن اور تجربہ کام کر رہا ہے، وہ ہم پر کھلتا ہے جب ہم اس سے ذرا پہلے کا یہ اندراج پڑھتے ہیں: امیر خسرو (۱۳۱۳ء ۲۴ زی حجہ ۱۳ ھ) کو حضرت نظام الدین کی مجلس کا بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس روز حضرت کے قدم چومے اور انھوں نے ...... "کلاہ چار ترکی بر سر بندہ نہادند و بشرف بیعت مشرف گردانیدند۔ الحمدللہ ......" پھر وضاحت کی کہ ٹوپی میں چار گوشے ہیں، اوّل شریعت کا خانہ، دوسرا طریقت کا، تیسرا خانہ معرفت کا اور چوتھا "خانہ حقیقت"

مزید تفصیل یہ بتائی کہ رسول اللہ نے ایک ترک والی ٹوپی ابوبکر صدیق کے سر پر، دو ترک والی حضرت عمر خطاب کے سر پر رکھی، تین ترک والی حضرت عثمان کو بخشی اور چار ترک والی علی مرتضیٰ کو عطا کی۔ پھر چاروں کے الگ الگ مرتبے بیان کر کے فرمایا چار ترک والی ٹوپی" اصحاب اہل صفہ" وسادات و طبقہ مشائخ کرام بر سر نہادہ اند"

و مراد ترک چہارم آنست کہ طہارت القلب من حب الدنیا مبنی

پاک گردانیدن دل را از دوستیِ دنیا و آنچہ در وست . . . .

اگرچہ افضل الفوائد، لفظ بلفظ امیر خسرو کی تالیف نہیں تاہم یہ حقیقت کہ انھیں ۱۹۱۲ء میں پیرو مرشد نے اَوروں کی موجودگی میں چار ترک ٹوپی کا اعزاز بخشا، دونوں کے سوانح نگار کے لئے نہایت اہم ہے کیوں کہ اس سے ان کے روزمرہ معمولات، خیالات اور خود فن پر ان کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔ امیر اپنے دل کو دوستی دنیا سے اس طرح پاک کرنے لگتے ہیں کہ مناظر کی کثرت میں وحدت، کائنات کے نشیب و فراز میں ایک آہنگ، عقیدوں کے اختلاف میں ہم آہنگی اور خود اپنے شاعرانہ وجود کی گہرائی میں پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے۔

انھی تین برسوں میں انھوں نے اپنا چوتھا دیوان "بقیہ نقیہ" مرتب کیا اور پہلی بار اپنے دیوان میں غزلیں شامل کیں یعنی غزلیں، جنھیں اب تک وہ محض تفریح طبع یا بزم آرائی کا سامان اور کمتر درجے کی شاعری شمار کرتے تھے، لیکن خواجہ کے ہاں محفل قوالی (یا سماع) کے وقت غزلیں ہی لے اور لحن کے ساتھ سنائی جاتی تھیں، عام لوگ انھی سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اپنے طور پر گاتے پھرتے تھے، جن کے ترنم میں یقینی طور پر طبلے کی تھاپ اور ساز کے سرگم درپردہ موجود تھے۔[۴۲]

انھی برسوں میں امیر خسروؔ نے وہ پانچ ضخیم اور قاموسی (انسائیکلوپیڈیائی) رسالے ترتیب دیے جن میں اپنے زمانے کے نثر و نظم، معاشرت و معیشت، رزم اور بزم کے نکات یوں بکھیر دیے ہیں جیسے ریت میں چاندی کے ذرّے۔[۴۳]

اسی زمانے میں انھوں نے اپنی ترکانہ عصبیت کو زیر کیا۔ اور اس کی لگام گہری انسانی ہمدردی کے ہاتھ میں دی۔ اور یہی زمانہ ہے جب انھوں نے اپنی سب سے مفصل[۴۴] مکمل، رنگین اور دل نشین مثنوی "دول رانی خضر خاں" (بعد کے اضافوں کے ساتھ) ایسے وقت اپنے عام قدر دانوں کے سامنے رکھی جب اس مثنوی کا ہیرو خضر خاں تہِ تیغ کیا جا چکا تھا اور اس کی اصلی ہیروئین "دُوَل رانی" نئے بے دریغ بادشاہ (قطب الدین مبارک شاہ) کے قید حرم میں لائی جا چکی تھی۔

اس لڑکی کا تعارف جس اہتمام سے کرایا ہے، وہ بھی غور طلب ہے۔

برسم ہندوی از نام و بالشں	در اوّل بود "دیول دی" خطابش
بنامِ آں پری چوں دیوزہ داشت	فسونِ بندہ از دیوش نگہداشت
یکی علّت در و افگندم از کار	کہ "دیول" را "دُول" کردم بہنجار
دُوَل چوں جمع دولتہاست در شمع	دریں نام است دولت ہا بسے جمع
چو رانی بود صاحب دولت و کام	دُوَل رانی مرکّب کردمش نام
خطابِ ایں کتاب عاشقی بہر	"دُوَل رانی خِضر خاں" ماند در دہر
....	....
دگر چوں "لیلی و مجنوں" بہ ترتیب	"دُوَل رانی خضر خاں" کرد ترکیب(۵۷)

نسوانی کرداروں کی اہمیت

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ لکھنے کی فرمائش تو شہزادے نے کی تھی، مثنوی کے سرچڑھی "دَوَل رانی" اور نام میں ہلکی سی ترمیم کرکے امیر نے اس کی معنویت و عظمت بڑھادی۔ اسی طرح خمسے کی ایک مثنوی کا نام "شیریں خسرو" ہے۔ دوسری کا اگرچہ نظامی کے برعکس "مجنوں و لیلیٰ" رکھا تھا، تاہم کہیں کہیں "لیلیٰ مجنوں" لکھ جاتے ہیں، یعنی اوّل لیلیٰ، بعد مجنوں، جب امیر خسرو نے امیر وقت سے بے نیازی برت کر ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں خمسہ کی نیت باندھی اور پہلی مثنوی "مطلع الانوار" تمام کرنے لگے تو اپنی نوعمر بیٹی "مستورہ میموں" سے یوں خطاب کیا۔

اے رُخِ تو شمع و چراغ دِلم	خوب ترین میوۂ باغ دِلم
گرچہ کہ اخوانِ تو نیک اخترند	نے ز تو در دیدۂ من بہتر اند(۵۸)

یہی حال خمسہ کی دوسری مثنویوں کا بھی ہے کہ بیشتر نسوانی کردار اپنی خوبیوں میں مردوں سے بڑھ جاتے ہیں۔ بعد کی تحریروں، خصوصاً "نہ سپہر" "رسائل الاعجاز" اور "تغلق نامہ" میں عورت مظلوم ہے، باوفا، پاکباز اور جاں نثار ہے۔ اور مصیبت کے وقت مردانہ وار ہے۔ یہاں تک کہ ستی اور جوہر کی دہشتناک رسموں میں بھی وہ عورت کی قربانی کے نغمہ سرا نظر آتے ہیں۔ عشق کے اظہار میں

بھی عورتوں کی زبان پُردرد اور اثر انگیز ہے۔ ایک دو حکایتی مثالیں چھوڑ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امیر خسرو میں (اپنے ہم عصر "ولایتی" شعرا کے برخلاف) عورتوں سے ہمدردی بلکہ طرفداری کا جذبہ جو پوشیدہ تھا وہ بروئے کار آگیا ہے۔ ماں کی ممتا کی نفسیاتی تاثیر خواجہ نظام الدین کی شفقت و محبت نے اور تیز کر دی اور گویا ساری محبتوں اور شفقتوں کے سرچشمے کو ایک وسیع انسانی دھارے میں بدل ڈالا۔

مادرِ وطن ہندستان سے ان کی الفت بھی اسی پاٹ دار دریا کی ایک موج ہے، یہ موج اس لیے متلاطم ہوگئی کہ نووارد "ولایتی" فاتحانہ رعونت میں آئے دن ہندستانی ماحول، کلچر اور اہل قلم پر طنز کیا کرتے تھے۔ ان کے جہل کی حقیقت جاننے کے علاوہ خسرو نے چاروں کھونٹ گھوم کر مفتوح، مغلوب اور تبہ حال ہندستان کی صناعی، باریکی، ذہنی اور فنی کمال، تہذیبی گہرائی اور رنگارنگی کے جلوے دیکھ لیے، پھر یہ جانا کہ چھوٹے چھوٹے رجواڑوں اور تہذیبی اکائیوں (یا اس وقت کے تصور سے کہیے کہ تہذیبی خلوتوں) کو بزور شمشیر مٹا کر، تاراج کر کے جو سیاسی اور انتظامی وحدت (مرکزیت) قائم ہوتی تھی، وہ دیرپا نہیں نکلی۔ بیرونی حملوں اور مرکزی حکومت میں معمولی سے خلفشار کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف شورش اور بغاوت کے شعلے اٹھنے لگتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے دور و نزدیک کی ان سیاسی اور تہذیبی منڈیروں کو مسمار نہیں کیا، انھیں مرعوب یا مغلوب کر کے ساتھ ملا لیا، تب علاقوں کے بجائے ملک کا ایک نقشہ ابھرا اور سرحدیں محفوظ رہ سکیں۔ اندرونی نظام کے امن نے بیرونی حملوں سے نمٹنے کا سامان مہیا کیا۔

امیر خسرو بادشاہ کے دم قدم کے ساتھ تھے اور اپروچ کی تبدیلی کے اس عمل میں محض خاموش تماشائی نہیں تھے۔ وہ دیکھتے ہوں گے کہ عمل اور نظریے دونوں میں 'جارحانہ رد' کا وقت گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے، 'مصالحانہ قبول' کی ضرورت اور گنجائش پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ رد و قبول کے اس دیرینہ عمل میں ان کا دل قبول کے ساتھ ہوگیا۔"

تصوف کو محض ایک شغل بنانے کے بجائے اپنے وجود کے رگ و پے میں بھر لینے کی شہ ملی خانقاہ سے اور اس بزرگ کی نظر آبیاری کرتی رہی جس کی آنکھیں دن بھر کے روزے اور رات بھر کی عبادت سے سرخ رہتی تھیں، جس کے فقیری خوان سے شب و روز سیکڑوں مہمان پیٹ بھر کر کے اٹھا کرتے تھے، جہاں مذہب ملت، رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا ــــ مقناطیس، نے کچے سونے کو کھینچ لیا اور اسے کندن بنا دیا۔

۶

اُدھر قصر ہزار ستون میں سلطان علاء الدین کی آنکھ بند ہوئی، اُدھر ملک نائب (چیف آف سٹاف ریزی) سیہ فام کافور نے بڑے شہزادے خضر خاں کی آنکھیں نکلوالیں (جو بحکم سلطانی گوالیار کے قلعے میں نظر بند تھا) اور سات سال کے بچّے کو تخت نشین کرکے خود عنان حکومت سنبھالی۔ کم سن شہزادے شہاب الدین کی ماں جا ٹھیاپالی، رائے رام دیو کی بیٹی تھی۔ اس سے نکاح کرکے کافور نے غالباً بادشاہ کے سوتیلے باپ کا سا اعتبار حاصل کرنا چاہا۔ خضر خاں کا ہم عمر، سوتیلا بھائی مبارک قید کردیا گیا — اور جب اس کو اندھا کرنے کے لئے چار "پَیک" (باڈی گارڈ) بھیجے گئے، وہ شہزادے کے حامی بن کر پلٹ پڑے اور محل میں گھس کر ملک نائب کا ہی خاتمہ کردیا۔ چند روز بعد ۱۸۔ اپریل ۱۳۱۶ء (۲۴ محرم ۷۱۶ھ) کو یہی مبارک خاں، قطب الدین کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا۔ (۷۹)

یہ تین مہینے امیر خسرو پر، بے نیازانہ جینے کے باوجود، کتنے سخت گزرے ہوں گے، اندازہ ہو سکتا ہے۔ ملک کافور اور خضر خاں دونوں اُن کے ممدوح رہ چکے تھے۔ دونوں معتوب ہوئے۔ کئی اور ممدوح اور قدرداں ارد ب میں آگئے۔

نئے بادشاہ نے تخت نشین ہوتے ہی خضر خاں کو خط لکھا کہ تم نے باپ کی عزت کو بٹّہ لگایا کہ گجرات کی ایک کنیز کے سامنے سر جھکاتے ہو، اسے فوراً دلی بھیجدو۔ ظاہر ہے کہ خضر خاں

نے اپنی اس مونس تنہائی کی حمایت کی اور اس بہانے وہ قتل کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ خطرے کی دو سمتیں اور تھیں :

خسروؔ کی عام مقبولیت اور خاص سرپرستی نے ان کے حاسد اور دشمن بھی پیدا کر دیے تھے۔ خصوصاً سعد منطقی اور عبید شاعر — دونوں دربار کے حاضر باش تھے اور فوجی مہموں میں بھی جایا کرتے تھے۔ توقع ملتے ہی امیر کو نیچا دکھانے کی گھات میں رہتے ہوں گے۔

خواجہ نظام الدین، جن کی درگاہ پر اب خسروؔ قریب قریب ہر شام بعد مغرب حاضر رہنے لگے تھے، علما کے تو محسود تھے ہی، رفتہ رفتہ بادشاہ کی نظر میں کھٹکنے لگے جو نوجوانی، اقتدار اور دولت کے نشے میں بدمست تھا۔ والیان حکومت یکے بعد دیگرے تخت سے اتارے، مارے یا سازش کا نشانہ بنائے جاتے — لیکن پائے تخت میں ایک سفید ریش درویش کی خانقاہ پر مرادیں مانگنے اور زیارت کرنے والوں کی ایسی چہل پہل رہتی کہ راستے میں جا بجا زائرین کے لئے سایہ دار چبوترے اور پانی کی سبیلوں کا انتظام کیا جانے لگا۔ ان کے بڑھتے ہوئے حلقہ اثر کے خلاف بھی بادشاہ کے کان بھرے جاتے ہوں گے۔ موت و حیات سے بے نیاز جینے والے خواجہ کی سپر بنے ہوئے تھے خسروؔ، لیکن کہاں تک!

امیر خسروؔ نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں لکھا تھا کہ مجھ سے پہلے صرف ایک شاعر گزرا ہے جس نے تین دیوان چھوڑے، مسعود سعد سلمان (لاہوری) مگر اس نے ایک عربی میں، دوسرا دری (فارسی) میں، تیسرا ہندی میں لکھا۔ لیکن میں تنہا شاعر ہوں جس نے ایک ہی زبان (دری) میں تین دیوان مرتب کر دیے۔

عالمانہ انکسار کے باوجود ان کے ہاں شاعرانہ تعلی کچھ کم نہیں۔ اسی قسم کی تعلی سے چڑ کر مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۱ء) کو اس کے ہم عصر شعرا نے حسد کا نشانہ بنایا اور بادشاہ کے کان ایسے بھرے تھے کہ وہ امارت کے مقام سے اتار کر سیدھا قید خانے بھیجدیا گیا۔ دس سال سزا کاٹنے کے بعد رہا ہوا، جالندھر کا حکمراں اور پنجاب کا گورنر بنایا گیا۔ غزنوی حکومت میں انقلاب آیا تو پھر اس پر تہمت لگی اور دوبارہ قید ہوا۔ عمر کے تیرہ سال جیل کی سختیاں کاٹنے کے بعد باہر نکلا تو وہی عمر (۶۰ سال) تھی جس عمر میں خسروؔ کو یہ سارے خطرے در پیش ہیں۔

مسعود سعد سلمان اور عبید نقیبہ۔ جن کا کلام اور ذکر امیر خسرو کی زبان پر آیا، دونوں اپنی بے باکی، صاف گوئی، درباری تعلق اور شاعرانہ مقبولیت اور مرتبے کی بنا پر حریفوں کی سازش کا شکار ہوئے اور جیلوں میں جوانی کاٹ کر مرے۔ امیر نے اس پس منظر میں صورتحال کا جائزہ لیا ہوگا اور جوں ہی سنا کہ قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے دربار میں دعوا کیا ہے کہ میں اہل قلم کو اتنا دوں گا جتنا کبھی کسی بادشاہ نے نہ دیا ہو:

زگنج گراں مایۂ بے شمار
دہم بار پیلیش نے، پیل بار[۸]

امیر خسرو نے جھٹ سے خواب میں بشارت پائی اور وہ "زمین بوس" کے لئے پہنچے۔ بعد میں عرض کیا کہ[۸۱]

شہا، گنج بخشا، کرم گسترا — معانی شناسا، سخن پرورا
مرا عمر کز شصت بالا گزشت — ہمہ پیشِ شاہان والا گزشت
بسے بندگی کردم از عونِ بخت — کمربستہ در خدمتِ چار تخت

اگلے تینوں بادشاہوں کا نام لینے کے بعد کہتے ہیں:

شدا کنوں کہ اقبال ہمدم مرا — تو از زندہ شد قطبِ عالم مرا
چنیں بخششے کز تو جم یافتم — ز شاہان پیشینہ کم یافتم

یعنی قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں بھی اقبال مندی نے ان کا ساتھ دیا۔ اور جب بادشاہ نے (۱۳۱۷ء میں) باپ کے نقش قدم پر چل کر اگلے سال دیوگری کا رُخ کیا تو امیر خسرو کو ساتھ رکھا تاکہ وہ ان واقعات پر نظر رکھیں اور آگے چل کر نظم کر دیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب دہلی کے باہر اس مہم کے لئے فوج نکالی گئی تو سولہ کلو میٹر میں پھیلی ہوئی تھی[۸۲]۔ جنوبی ہند کی طرف یہ امیر خسرو کا پہلا، بقول بعضے دوسرا سفر تھا اور حقیقت ہے کہ بڑھاپے کی اس یک سالہ زحمت سفر کا حاصل زبردست نکلا۔ بادشاہ کا "سیاہ چتر" دیوگری پہنچکر ایلورا کے قریب ٹھیر گیا وہ نہیں رہا لیکن خسرو خاں اور امیر شکار ملک قتلغ اور کئی امیروں کو شاہی لشکر کے چنے ہوئے جوانوں ہمیت ورنگل کی طرف روانہ کر دیا۔ امیر خسرو آگے نہیں گئے البتہ

انھوں نے ایک ایک تفصیل کرید کر معلوم کرلی ۔

چنیں کردہ ام مشکل فتح راحل

زدانندگان غزائے ارنگل[۸۳]

یہ فوج "تلنگ، ارنگل اور جنگل" سے فتح مند واپس آئی۔ خراج اور مال غنیمت میں سونے، چاندی، ہیرے جواہرات کے انبار، سیکڑوں ہاتھی اور ہزاروں گھوڑے، قیمتی سامان اور کپڑے لادے ہوئے شاہی لشکر سے آکر مل گئی۔

البیرونی سے خسرو تک

امیر خسرو نے واپسی پر ۴۵۰۹ اشعار کی ایک بیش بہا مثنوی "نہ سپہر" لکھ کر پیش کردی معلوم نہیں اس شاہ جم جاہ سے کیا اور کتنا صلہ ملا، لیکن خسرو کو دربار سخن سے جو صلہ ملا وہ بے مثال تھا؛ مورخین (مثلاً برنی اور فرشتہ) کے بیان کو جانچنے میں بھی اس مثنوی سے سندلی جاتی ہے۔

گشت ہر پردہ زنقش مستقیم

چوں خیال شاعر و ذہن حکیم

صورتے بنمود بر ہر سو جمال

کانچناں صورت نہ بندد در خیال[۸۴]

یہ اشعار انھوں نے سپہر ہفتم میں جشن نوروز کے بیان میں لکھے ہیں جب شمال و جنوب کا حسن، دولت، زیورات، آرائش، کھیل تماشے، شعبدے اور جادو، تلوار کے ہنر اور سازوں (مثلاً نائے، چنگ، بربط، عود، رباب، دف اور جھانجھ) کے باج دہلی میں یکجا ہو گئے ہیں؛ بالکل یہی مصرعے خسرو کی اس مثنوی پر صادق آتے ہیں جس میں جوش بیان کے بجائے سلاست اور مبالغے کے بجائے بیان حقیقت اور عام استعاروں کی جگہ اشیاء اور اسماء کی تفصیل بلکہ تصویر کھینچی ہوئی ہے[۸۵]۔ ہندستان کی طرف سے خم ٹھونک کردہ پہلے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے، لیکن یہاں (سپہر سوئم کے، تقریباً چارسو اشعار میں) دہلی، اہل دہلی اور ہندستان کی حمایت میں علمی دلیلیں قائم کی ہیں۔ جتنی سنجیدگی ہمدردی اور کرید سے البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء)

نے ہندستانی سماج، اور اس کے علوم اور رسوم کی تلاش کی اور جن نتیجوں پر وہ پہنچا تین سو برس بعد امیر خسرو بھی اسی راہ سے، انھی نتیجوں پر پہنچے۔ فرق یہ کہ وہاں علمی تلاش رہنما تھی اور یہاں شاعرانہ بصیرت[۴۹]۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جن معنوں میں ابو ریحان محمد بن احمد الخوارزمی (البیرونی) آخری کڑی تھا عربوں کی تلاش ہند کے تین صدی طویل سلسلے کی، انھی معنوں میں امیر خسرو پہلی کڑی ہیں ہندستان کے نئے سیاسی حالات میں ہمدردانہ نقطۂ نظر کی، جس نے صوفیا اور فارسی اُردو شعرا کی صفوں میں اپنے ترجمان پائے۔

اِس مثنوی میں (جس کے بعض اشعار بعد کے اساتذہ کے ہاں بھیس بدل بدل کر آتے ہیں) خسرو نے نجوم، ہیئت (فلکیات)، لباس، تیر تلوار، مختلف زبانوں، گھوڑوں، کھیلوں، لوگوں، موسموں اور نسلوں کے بارے میں معلومات کا انبار لگا دیا ہے۔ انھی معلومات کہ "ہندستانی معاشرہ، عہدِ وسطیٰ میں" کے مصنف کے لئے امیر خسرو سب سے اہم ماخذ بن گئے ہیں۔ تاریخ ہند کے مؤلف ایلیٹ نے جابجا امیر کے بیانات سے حوالے دیے ہیں۔ "نہ سپہر" میں پہلی بار اُنھوں نے شراب کی مذمت کی ہے، وہ بھی شراب میں دھت رہنے والے بادشاہ کے جان و مال کو دعائیں دے کر۔

هم چو مل کز وے خرد گردد خراب

عقل را دشمن و لیکن دوست روی
دوستے صافی مزاج و تند خوئی

بادشاہ کو خسرو کے پیرو مرشد سے جو پرخاش تھی، اس کی پرواہ کیے بغیر، یہاں اتنی ہی شدت سے نظام الدین کی مدح سرائی کی ہے۔

یہیں وہ روحانی محبت، خدا اور مخلوق کے قریب ترین رشتے، انسانی الفت اور تصوف کی تعلیم میں پوشیدہ خدمتِ خلق پر زور دیتے ہیں۔

یہیں انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کا بڑھ چڑھ کر ذکر کیا ہے، ان کے فنی کمالات کو سراہتے ہوئے

.. یہاں تک انکسار برت گئے کہ خسرو جیسے خود نگر شاعر کی زبان سے، اگر کبھی پہلے سنا ہوتا تو، اوپری معلوم ہوتا وہ اوسط درجے کے ہم عصروں کا نام دے کر آخر میں اپنا نام لائے ہیں۔

کمترین ہمہ مسکین خسرو

وہ اُن قلعوں، شہروں، مندروں، فن کاروں اور ہنرمندوں کی ستائش کرتے ہیں جن پر بیداد ہوئی، مگر داد نہ ملی (۳۹)

وہ بادشاہ کی مدح کو تمہید بنا کر اُسے کھلے لفظوں میں نصیحت کرتے ہیں کہ (۴۰)

پنج بنا شرط جہانداری است

آید از وکش زخدا یاری است

پھر پانچوں شرطیں گنائی ہیں۔ (۱) سلطنت کی پالیسی مضبوط اور انتظامی مشین سچی ہونی چاہیے۔ (۲) اندر عزم ہو، باہر سکون۔ یعنی امتحان کے وقت ارادہ اٹل اور چہرہ پُر وقار ہے (۳) دوراندیشی میں غفلت نہ ہونے پائے (۴) پرجا کو انصاف ملے کہ کسی کی فریاد بلند نہ ہو (۵) خاص وعام کی آسودگی یا فلاح پیشِ نظر رہے۔

برہمہ دارد بہ بیابان و کاخ

جا خوش ورہ ایمن و نعمت فراخ

پھر ایک ایک نکتے کو تفصیل وار تاریخی قصے اور مثالیں دے کر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ پانچ چھ صدی پہلے دہلی کے راجہ انگ پال کی ڈیوڑھی پر پتھر کے دو شیر بنے ہوئے تھے جو قوت انصاف کی علامت تھے اور ان کے پہلو میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جسے فریادی آ کر بلاتے اور انصاف طلب کرتے تھے۔

وہ اس مثنوی میں عیش پسند اور شہوت پرست بادشاہ کو (جسے روزانہ، سفر و حضر میں نوجوان مرد و زن (۴۱) پر مردانگی خرچ کرنے اور بدمست ہو جانے کی عادت تھی) صاف صاف جتاتے ہیں کہ :۔

تاجورانے کہ تنعم کنند

حزم خود از عیش و طرب کم کنند

اور بالآخر بادشاہ کے چٹکی بھر لیتے ہیں :

ہوشش براں دار کہ در زیرِ پوست
دشمنِ خود باز شناسی ز دوست

اوروں کے علاوہ، خاص اِس مثنوی کو پڑھ کر وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں پہلے دن سے مغل شہزادوں کو خسرو کی مثنویاں لفظ بلفظ پڑھائی جاتی تھیں اور خوش خطی کی مشق میں وہ انھیں نقل کیا کرتے تھے"(۹۰)

نظام الدین اولیا کے مرید خسرو نے شاعری کے تقریباً آخری کارنامے سے وہ کام لے لیا جو ہمیشہ سے اس کا آخری اور پیمبرانہ فریضہ رہا ہے۔ مگر نوعمر، ناز پروردہ بادشاہ نہیں چیتا۔ پہلا سال اس نے شاہی کے ولولے اور اپنا میدان صاف کرنے میں گزارا، دوسرا سال طمطراق، سفاکی اور فوج کشی میں، تیسرا اور چوتھا "کھال کے اندر دشمن" پالنے اور اس کی خاطر، بے حیائی کی حد تک اپنے دوستوں کو بے دخل اور ذلیل کرنے میں۔

اگر شاہی نقار خانوں میں دانشور طوطی کی پکار سنائی دے جاتی تو سلطنت پُشت در پُشت چلا کرتی، دست بدست کیوں بدلتی!

آخر، ۷ مئی ۱۳۲۰ء (۲۰ ۷ھ جمادی الثانی کی چاندرات) کو قطب الدین مبارک اپنے خلوتیانِ راز کے ہاتھوں اسی قصرِ ہزار ستون میں قتل کر دیا گیا جہاں اس نے اپنے عزیزوں اور مُشتبہ یا بے قصور ملازموں کے قتل کے فرمان جاری کیے تھے۔

۷

دریں ملک از پسے فتنہ کہ برخاست
خیرزیں گونہ دارم راستا راست

ٹھیک چار سال چار مہینے بعد، اُس رات کو جس کی صبح خواجہ نظام الدین کو حکم تھا کہ بادشاہ کے سلام کے لئے حاضر ہوں، یا حاضر کئے جائیں، خواجہ پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنی خانقاہ میں موجود تھے، بادشاہ اپنے محل میں نہیں تھا جیسے ڈرامائی حالات میں اس نے اپنا سر بچایا تھا، ویسے ہی ہولناک ڈرامے کے ڈراپ سین میں سر دے دیا۔ براوو قبیلے کا دلبر اور قبول صورت جوان حسن، جو خسرو خاں کے لقب سے تخت نشین ہوا علائی خاندان کے کم سن بچوں کو راتوں رات قتل کرا چکا تھا۔ امیر نے تصدیق کر کے آخری مثنوی "تغلق نامہ" میں یہاں تک تفصیل درج کردی ہے کہ کونسا بچہ اس خونین واقعے کی شام کونسا سبق پڑھ چکا تھا اور کس حال میں تھا۔ امیر خسرو اپنی پچھلی مثنوی میں، کچھ تو بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اور کچھ محاکات کا فرض ادا کرنے کے لئے اسی خسرو خاں کی فوجی فتوحات پر داد دے چکے تھے۔

خسرو خاں نے اپنی اَن پڑھ مگر جنگجو برادری "براوو" کے لوگوں کو ہر قسم کی چھوٹ دے دی۔ قصر ہزار ستون اور کوشک سرخ (لال محل) کے اندر اور باہر انھوں نے چند روز اپنی

کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن چند روز کے بعد ہی ایک بے چین سا امن قائم ہوگیا اور جن امرا سے کوئی فوری خطرہ نہیں تھا وہ اپنی اپنی جگہ بحال رہے۔

قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے قلعہ داروں اور گورنروں یا باج گزاروں کے بیٹے بھتیجے مرکز میں رہ کر خدمت انجام دیں۔ وہ والیِ وقت کی ہمراہی میں جاں نثاری کی تربیت پانے کے علاوہ دور دراز کے طاقتور امیروں کی طرف سے وفاداری کی ضمانت بھی بنے رہتے تھے۔ دیپال پور چھاونی کے قلعہ دار غازی ملک کا بیٹا فخرالدین جوناخاں، جسے خسرو خاں نے آخور بیگ (داروغۂ اصطبل) کا عہدہ دیا، ایک اندھیری رات میں تیز رفتار گھوڑے اور چند آدمی ساتھ لے کر دہلی کی حدود سے نکل کر دیپال پور کی طرف فرار کر گیا[۹۱] باپ نے بیٹے سے تمام عبرت ناک حالات سنے اور پیغام بھیج بھیج کر دو مہینے کے اندر حلیف تیار کر کے دہلی کی طرف لشکر بڑھا دیا۔ ہریانہ کے مقام حصار پر اسے دہلی کی فوج نے ٹوکا اور شکست کھائی۔

"........ اور جب وہ نمک حرام (خسرو خاں) غازی ملک کے آنے سے خبردار ہوا اور دروازہ خزانے کا کھول کر بعض سپاہیوں کو سہ سالہ اور بعضوں کو چہار سالہ اور بعضے کو ڈھائی سالہ پیشگی تنخواہ دی اور مشایخوں کو بھی زرِ خطیر تقسیم کر کے ایک حبّہ خزانے میں نہ چھوڑا اور جواہرات آدمیوں کو بانٹ دیے........"[۹۲]

اس نقد رقم کا قابلِ ذکر حصہ خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی پہنچا اور انھوں نے حسبِ عادت محتاجوں اور سائلوں میں تقسیم کرا دیا۔ اور جب خسرو خاں کے پنج ماہہ اقتدار کا خاتمہ کرنے کے بعد غازی ملک نے حکومت کا چارج لیا اور خزانہ خالی پایا تو جن جن خاندانوں یا خانوادوں میں رقم پہنچنے کی اطلاع تھی، وہاں سے بجبر طلب کیا۔ یہاں تک کہ دس فیصدی فوری واپسی کی شرط عائد کر دی۔ خسرو کے پیرومرشد کے پاس کیا بچا تھا کہ دیتے۔ انھوں نے ادائگی سے مجبوری ظاہر کی تو نئے بادشاہ کے دل میں کدورت بیٹھ گئی۔

کدورت کی دو وجہیں اَور بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جن تنگ نظر علما کے اثر میں رہا تھا وہ خواجہ کی خانقاہ پر میلے کی دھوم دھام اور سماع، کی "غیر شرعی" رونق سے ناخوش تھے دوسرے یہ کہ خواجہ باللہ نے اس انقلابِ حکومت، علائی خاندان کی تباہی اور خسرو خاں کے خلاف

زبان نہ کھولی تھی۔ اور ایک حلقہ ان کے سیاسی وسماجی اثر پر انگلی اٹھا چکا تھا۔

امیر خسرو، معلوم ہوتا ہے کہ خسرو خاں فاتح دکن سے خوش تھے، قطب الدین مبارک شاہ کی شہوت پسندی کے شکار خسرو خاں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن اس کے قبیلے کی انداد ھند سفاکی نے ان کا دل پھیر دیا۔ چناں چہ ان کی زبان پر پراوو، اور ہندو، کافر اور مرتد کا لفظ بار بار آیا ہے۔

۶ ستمبر ۱۳۲۰ (شعبان ۷۲۰ھ) کی چاندرات کو دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ حوض شمسی پر جہاں اب حوض خاص ہے لہراوت کے میدان میں ملک غازی کی فوج نے صف بندی کرلی۔ یہ جنگ، جو غازی ملک تغلق کی فتح پر تمام ہوئی دہلی کی سب سے خوں ریز جنگوں میں سے تھی۔ اس جنگ نے ہندستان کو آئے دن کی خانہ جنگی سے نجات دیکر کافی عرصے کے لیے مرکزی، طاقتور سلطنت بخشی، وہیں اس کی بعض تفصیلات جن کی تصدیق امیر خسرو کے بیان سے ہوتی ہے، تاریخ ہند کے طالب علم کے لئے نہایت اہم ہیں:

- دہلی کی فوج میں کم از کم دو لاکھ مسلّح سوار موجود تھے جن میں سے چالیس ہزار صرف ہراول میں بھیجے گئے؛
- ملتان اور دیپال پور کی طرف سے جو فوج بڑھی اس کی تعداد بھی کم تھی اور اپنی فتح کا یقین بھی نہیں تھا۔ فتح کا نقارہ بجنے تک لڑائی برابر کی رہی۔
- ملتان کی فوج میں غز، ترک، منگول، تاجیک اور روسی شامل تھے۔ روس کے منگول سلطنت میں شامل کیے جانے کے بعد روسیوں کا "اوپر کی فوج" میں بھرتی ہونا یا سرحدی ملکوں میں فوجی ملازمت کے لئے جانا اس لئے بھی قرین قیاس ہے کہ "تو ویر" کے شہر کا افاناسی نکی تین ایران کے راستے اسی تغلق خاندان کے دور حکومت میں بیجاپور اور بیدر تک پہنچا[۹۳]

تاجیک و خراسانی سپاہیوں کے ساتھ "پاک اصل" کہہ کر امیر خسرو جتاتے ہیں کہ

نگشتہ اصل بد با اصل شان وصل

یعنی وہ تازہ ولایت تھے، ان کا خون ہندستانی خون میں نہیں ملا تھا یہی نہیں بلکہ

سواراں بیشتر ز اقلیم بالا   نہ ہندستانی و ہندو "لالا"

مطلب یہ ہے کہ اوپر سے آنے والے سوار مقامی فوج سے زیادہ طاقتور اور جنگجو ہوتے تھے۔ ان کی ایک صفت یہ تھی کہ

لیسے صف ہائے "تا تاراں شکستہ

○ اس جنگ کو اگرچہ بعض شعرا اور مورخین نے "جہاد" کا خطاب دیا، تاہم دہلی اور پنجاب دونوں لشکروں میں مسلم و غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ دہلی کے لشکر میں آدھوں آدھ ہندو اور مسلمان تھے، پنجاب کے لشکر میں کئی رجمنٹیں غیر مسلموں (مثلاً کھوکھروں . . . . .) کی تھیں۔ حسن براد و خسرو خاں کے کمانڈروں میں جہاں خان وملوک آخری دم تک اس کے ساتھ رہے، وہیں مسلمانان دہلی بھی شریک تھے ۔ اگر اس کی ایک رجمنٹ سے نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تو دوسری سے نعرہ "نارائن"۔

○ ایک زمانے کے بعد اب یہ جنگی اصول برتا جانے لگا تھا کہ راستے میں فوجی سپلائی پوری قیمت دے کر خریدی جائے۔

ملک غازی کے حکم کے مطابق:

ہمہ کالا بقیمت می خریدند	بریں ساں رہ بہ تیزی می بریدند

○ یہ بات کہ خسرو خاں کے ساتھ اس کے غیر مسلم "پیچ ذات" براد و بارہ سے پندرہ ہزار تک جنگ میں شریک تھے، مقامی مسلمانوں کو ایک مذہبی سماجی اصول کی تعمیل سے نہ روک سکی۔ اور وہ یوں کہ

بدہلی لشکرے کافزوں ز حد بود
زہر خانہ سوارے نامزد بود

ہر گھر سے جنگ پر ایک سوار جانے کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی سلامتی کا شعور مذہبی کے بجائے علاقائی یا جغرافیائی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ورنگل، معبر اور بنگال کی لڑائیوں میں بھی مقامی مسلمان اپنے ہندو ہمسایوں کے ساتھ شریک ہو چکے تھے ۔[۹۴]

○ اگرچہ ابھی بارود کا استعمال شروع نہ ہوا تھا تاہم اس کے جنگی استعمال کی ابتدائی شکل نمودار ہو گئی تھی۔ پتھر کے گولے کی توپ "مغربی" اور شکار کی "تفک" (بندوق) جنگ

میں کارآمد ہتھیار بن چکی تھیں۔

○ ملک غازی کی فوج میں نو مسلم مغل (منگول)، افغان (؟) ہندو، کھوکھر اور میو مقامی شکست خوردہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ کو مار ڈالا، اکثر کو لوٹ لیا، لیکن ہندو فوجیوں کو یہ شکست زیادہ مہنگی پڑی۔

○ شکست کے بعد جب خسرو خاں گرفتار کر کے لایا گیا اور اس سے فاتح ملک غازی نے سوال کیا کہ تو نے اپنے ولی نعمت کو کیوں قتل کیا تو اس نے جواب دیا:

اگر نار فتنی بر من نرفتے

ز من نا آمدے ویں فن نرفتے

یعنی خسرو خاں لواطت کے عیب میں بدنام بھی تھا اور اس سے اتنا بیزار کہ جان دے کر یا جان لے کر اس دھبے کو دھونا چاہتا تھا۔

دوسرے سوال پر کہ تمام شہزادوں کو کیوں قتل کیا، جواب ملا کہ میں نے کسی کے گلے پر خنجر نہیں پھیرا۔ میرے حمایتیوں نے یہ سوچ کر کہ آئندہ کے لیے کوئی تخت کا دعویدار نہ رہے، بدنیتی سے ایسا کر ڈالا پھر پوچھا گیا کہ خود بادشاہ کیوں بن بیٹھا تو اس نے جواب دیا کہ کوئی اور تخت نشین ہوتا تو مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔

ز بیم سر نہادم پائے بر تخت

آخر میں وہ فاتح سے درخواست کرتا ہے کہ میری دونوں آنکھیں نکال کر جان بخش دیجئے

○ سوال و جواب سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان کی رسم قدیم کہ جسمانی عیب کے ساتھ کوئی شخص تخت نہیں سنبھال سکتا، دہلی سلطنت کے وقتوں میں برقرار تھی، وہیں یہ بھی صاف ہے کہ امیر خسرو ملک غازی کے حامی ہونے کے باوجود خسرو خاں کی قصور وار شخصیت میں حالات کا ایک مجبور اور بے بس کھلونا بھی دیکھ رہے ہیں۔

غازی ملک خود بادشاہت کا طلب گار نہیں تھا، مگر جب اسے بادلِ ناخواستہ یہ ذمہ داری سنبھالنی پڑی تو اپنی ترک عصبیت کے ساتھ یک رخی مذہبی سادگی اور شدت بھی سنبھالے رہا۔ امیر خسرو کی مثنوی "تغلق نامہ" جو دونوں عصبیتوں سے نسبتہً پاک ہے

اور جو خود بادشاہ کے ایما یا فرمائش پر زندگی کے آخری برسوں میں لکھی گئی۔ والی حکومت کے مزاج کی طرح سادہ و بے تکلف و بے باک ہے، اور اسی نسبت سے کم سخن بھی۔ یہاں صرف تین ہزار ابیات ہیں (حالانکہ ساڑھے چار ہزار شعر کی "نہ سپہر" کے مقابلے میں یہاں کہنے، بیان کرنے کو بہت کچھ تھا۔)

اس کا سبب، جیسا کہ عموماً سمجھا گیا، امیر کی ضعیفی نہیں، بلکہ ذہنی و فنی پختگی ہے، حالات کا تقاضا ہے اور حقیقت پسندی ہے۔ امیر یہاں بیک وقت شاعر، مورخ اور اپنے طرز کے موجد نظر آتے ہیں۔

افسوس کہ "تغلق نامہ" اشاعت نہ پا سکا، سیاسی اسباب نے اُسے دبا دیا۔ ورنہ نثر میں "خزائن الفتوح" اور "اعجازِ خسروی" اور نظم میں "آئینۂ سکندری" "ہشت بہشت" اور "مفتاح الفتوح" کا وِرد کرنے والے یا انھیں فارسی کے ہندستانی طرز (سبک) کا پیشرو سمجھنے اور اختیار کرنے والے "تغلق نامہ" کو مثال بناتے تو "سبکِ ہندی" "خواہ مخواہ کے تکلف، پیچدار بیان، استعارہ اور غیر ضروری آرائش کا نام نہ ہوتا (۹۵)

اس آخری تصنیف میں بھی خسرو نے ہندستانی الفاظ اور محاورات کو فارسی سانچے میں ڈھالا ہے، بلکہ یہاں تو ان کی کثرت ہے مثلاً "حسن را یار گی یکبارگی ماند" یا "فرس ہندی و راوت نبیز ہندی" طرز بیان وہ ہے جسے ہم فردوسی کا برحق جانشین کہہ سکتے ہیں اور حق یہ ہے کہ "تغلق نامہ" ایک اہم شعری کارنامہ اور خسرو کے ذہنی ارتقا کا آخری نشان ہے۔

○

تغلق نے حکومت سنبھالی تو خزانہ خالی تھا اور جنوبی ہند میں سرکشی کی خبریں، مرض اور علاج دونوں وراثت میں ساتھ ملے۔ بوڑھے جنگ آزمودہ بادشاہ نے جوان بیٹے جونا خاں کو "دیوگیر" کی طرف روانہ کیا اور خود مرکز کا انتظام درست کرنے میں لگا۔

خواجہ نظام الدین روزانہ بعد عشاء خسرو کی زبانی شہر بھر کی خبریں اور دربار کے حالات سنتے تھے، ہر ایک نووارد سے اسی کے ذوق کے مطابق گفتگو اور اس کی دل جوئی کرتے تھے، ان کی محفل میں سرِ شام "سماع" ہوتا جس میں مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہوتے، فارسی، اَودھی، پنجابی اور برج بھاشا میں کلام سنایا جاتا۔ لوگ سر دھنتے، درویش اور اہلِ دل جوش میں کھڑے ہو جاتے اور وجد یا حال کی کیفیت میں دائرہ بنا کر حرکت کیا کرتے تھے۔

اگرچہ چشتی سلسلے کے بعض پیروں اور اکثر پیروؤں نے اپنی آزادانہ معاش کے لئے حلال پیشے اپنائے، زمین پر کاشت کی [۹۶]، تجارت کی، حرفت اختیار کی، لیکن خواجہ کی خانقاہ صرف "فتوح" (نذر نیاز کی آمدنی) پر چلتی تھی۔ تاہم بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومت وقت سے کوئی سیاسی یا معاشی امداد نہ لی جائے، بلکہ ممکن حد تک بے تعلقی برتی جائے۔

ملک غازی غیاث الدین تغلق کے دربار میں خواجہ کی طلبی ہوئی کہ وہ بادشاہ اور معترض کی موجودگی میں اپنی پوزیشن صاف کریں۔

خواجہ نے بھرے مجمع میں وضاحت کی کہ مشائخ اور درویشوں کے قدیم دستور کے علاوہ حدیث نبوی بھی اس کی تائید میں نکلتی ہے۔

اِنَّ لِنَفسِكَ عَلَيكَ حَقًّا ـــــ تم پر تمہارے نفس یا روح کا حق ہے

یعنی "جب طبیعت اور جسم پوری چوٹ کھا جائے تو ان کا حق ہے کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں۔۔۔۔۔۔۔۔

"چوں زمانے از سماع بیاساید باز او را بر کاسہ بہ بَرَند" [۹۶]

ایک عالمِ وقت مولانا علیم الدین نے، جو گواہ یا منصف کی حیثیت سے موجود تھے، خواجہ کی تائید کی یہ کہہ کر کہ

"........ جو دل سے سنتے ہیں اُن کے لئے حلال ہے، اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لئے حرام ...."

بحث کے بعد بادشاہ نے خواجہ کو جانے کی اجازت دے دی، نہ سماع کو منع کیا، نہ اس کی کھلی اجازت ملی۔ مگر خواجہ کا یوں اپنے مذہبی اور شہری وقار کے ساتھ رخصت ہونا اسے ناگوار ضرور گزرا۔ رفتہ رفتہ یہ ناگواری اس مشہور واقعے تک پہنچی کہ بادشاہ نے خواجہ نظام الدین کو ۱۳۲۴ء میں کہلوا دیا تھا کہ وہ میری واپسی سے پہلے دلی چھوڑ دیں اور خود بڑا لشکر لے کر بنگال کی طرف روانہ ہوا۔ امیر خسرو اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ تھے۔

لیکن بنگال کی فوجی مہم سے پہلے اس نے شہزادے جوناخاں کو دوبارہ جنوب کی مہم پر بھیجا۔ پہلی مہم تغرقہ، شکست اور بربادی پر ختم ہوئی تھی۔ جوناخاں پرانے راستے سے دیوگری ہوتا ہوا ورنگل، معبر، گٹی، راجہ مندری اور مدورائے کی طرف بڑھتا گیا، صرف راستہ ہی نہیں پالیسی بھی وہی تھی کہ مقامی راجاؤں، زمینداروں اور انتظامی یونٹوں کو برباد کرنے سے کم کوئی فیصلہ کر لیا جائے تاکہ آمدنی کے مستقل ذرائع اور اختیار اعلا دونوں مرکزی طاقت کو میسر رہیں۔ مدورائے میں یہ فوج ۱۳۲۳ء میں داخل ہوئی جب وہاں پانڈیا خاندان کی طرف سے عالی شہرت کے سنہرے، بیش خرچ بلند کئی مندر تعمیر ہو رہے تھے۔ آج بھی اندرونِ مندر سونے کا ستون اور منقش در و دیوار گواہ ہیں کہ محمود غزنوی سے غیاث الدین تغلق تک تین صدی کا فاصلہ ترک افغان حاکموں اور ان کے سپہ سالاروں کو ہندستانی تہذیب اور ہنرمندی کی قدر سکھانے میں، شعور کا منفر کرانے میں بڑی حد تک کامیاب رہا(؟)

واپسی میں اس شہزادے جوناخاں، ملقب بہ الغ خاں نے مشرقی ساحل کے علاقے خصوصاً اڑیسہ کے ساحلی مقامات فتح کئے۔ اسی دوران پھر ایک بار منگول فوج دریائے سندھ اتر کر سامانہ کی طرف بڑھی اور شاہی لشکر نے اسے منہ توڑ شکست دے کر منگول دہشت کے رہے سہے

آثار مٹادیے۔

شاہی لشکر بنگال کی طرف ایسے وقت بڑھا جب وہاں کے مقامی حکمرانوں میں رستہ کشی اور خوں ریزی جاری تھی۔ یہاں بغیر کسی کشت وخون کے مہم سر ہوگئی اور بغرا خاں کی اولاد میں سے ناصر الدین کو دہلی کا باج گزار بنا کر بٹھا دیا گیا اور واپسی میں ترہٹ بھی فتح ہوگیا۔ اس مہم میں امیر خسرو ساتھ ساتھ رہے، لیکن انھوں نے اس کی کوئی اہم یادگار نہیں چھوڑی ـــ وہ سفر وحضر میں اپنا دیوان زادہ "نہایتہ الکمال" ترتیب دینے میں مصروف تھے۔

انھی دنوں ان کے عزیز ترین فرزند "حاجی" کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا۔ یہ لڑکا درباروں، محفلوں اور خانقاہ میں امیر خسرو کا کلام ویسے لہک کر اور گا کر سنایا کرتا تھا جیسے امیر خسرو سناتے، اگر وہ ایک امیر، جلیل القدر شاعر اور خانقاہ نظامی کے مرید نہ ہوتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "تغلق نامہ" مکمل کرنے کے بہانے یا بوڑھاپے کا عذر کر کے امیر خسرو ترہٹ میں ٹھہرے بغیر دہلی کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے۔ ان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ خواجہ نظام الدین کہا کرتے تھے کہ خسرو میرے بعد جیے گا نہیں اور خواجہ کا وقتِ آخر قریب تھا۔

اکتوبر ۱۳۲۴ء کی آخری تاریخوں میں (ورنہ نومبر کے شروع میں) اس نئے محل کی چھت گری جس کے نیچے غمزدہ باپ نے اپنے سعادت مند بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا تھا اور پچھلے دو بادشاہوں کی طرح وہ بھی چار سال کی حکومت کے بعد آناً فاناً دنیا سے رخصت ہوا۔

چند روز بعد ۱۸۔ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) نظام الدین نے امیر خسرو کو یاد کیا اور ایک صوفی صافی نصیر الدین محمود "چراغ دہلی" کو خلافت کا خرقہ اور سلسلہ وار اپنے چاروں خواجہ بزرگوں کے تبرکات سپرد کر کے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

دربار۔ خانقاہ۔ فاصلے اور انجام

امیر خسرو اپنے پیر کے دل وجان میں اتنے بسے ہوئے تھے کہ شریعت کی اجازت ہوتی تو وہ قبر میں انھیں ساتھ سُلاتے، لیکن طریقت کے پروانے انھی چار مریدوں کو عطا ہوئے جن کی تمام زندگی اس مسلک کی نذر ہوئی تھی۔ خسرو اس مسلک کے ماننے والے تھے، مخلص تھے، وہ ان

کی روحانی تسکین کا سرچشمہ اور فکر و نظر کی روشنی تھا۔ مگر وہ ان کی کل کائنات نہیں تھا۔ وہ اس کے سوا بھی موجود تھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے شاہانِ وقت نے انھیں سراہا، قریب رکھا، فرمائشیں کیں، لیکن کوئی سیاسی یا فوجی منصب یا صوبے کی حکمرانی عطا نہ کی۔ وہ حکومت کا پرزہ ہو کر نہیں رہ گئے۔

امیر خسرو اپنے دور کی کہانی اور سیاسی سماجی تحریکوں اور اداروں سے باخبر اور علاقہ مند ضرور رہے، لیکن کسی ایک حالت یا حکومت سے اتنے بندھے نہیں کہ نظام حکومت کے زیر و زبر ہونے میں یا اداروں کے نشیب و فراز میں خود بھی بہہ جاتے گم ہو جاتے۔ وہ موجوں میں رہ کر پیاس بجھا کر موجوں سے نکلنا جانتے تھے۔

پانچویں سے پہلے، اپنے چار دیوانوں کی جو خانہ بندی انھوں نے کی تھی، وہی زمانے کے انقلابات اور اتفاقات، اداروں اور حلقوں کی بھی کی ہوگی (۹۸)

حدِ نظر سے آگے تک پھیلی ہوئی یہ دنیا ان کے نزدیک ہر ایک حد بندی سے آزاد تھی اسی میں ان کی شاعری کی رنگا رنگ تہوں کا، نغمے کا، مجاز و حقیقت کا، لطف اندوزی کا اور لافانی قوت و دل کشی کا راز چھپا ہوا ہے۔

انھوں نے ایک صبح خواجہ نظام الدین کو زینے سے اترتے دیکھ کر، ان کی شب بیدار آنکھوں کو خطاب کیا تھا:

تو شبینہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد؟

امیر خسرو کی "چشم مست" میں بھی "تلخ و شیریں راتوں" کے خمار کی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں۔
سلطان صفت درویش خواجہ نظام الدین اولیا ۱۸۔ ربیع الاول ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو سدھارے اور ان کے جاں نثار مرید امیر خسرو نے ۱۸ شوال کو اسی سال اسی دن، ہماری تضادوں بھری دنیا کی دل کشی کو خیرباد کہا۔

خلاصہ کلام

امیر کی ذاتی زندگی، مصروفیات، خیالات اور فنی کمالات کے پس منظر کے بطور اس زمانے کے اہم سیاسی، مادی واقعات کی لڑی پروئے ہیں لیکھک کی نیت یہ ہے کہ وہ پہلو ابھر کر آئیں جن میں ہم فنکار کے ذہنی اور فنی ارتقا کا، اٹھان کا، اور کج مج لائنوں کا نقشہ صاف دیکھ سکیں۔

جو تصویر ابھر کر آتی ہے اس میں چند نکتے سامنے کے ہیں:

۱۔ زندگی، سماج، تہذیب اور فن کے متعلق شاعر کا نقطہ نظر برابر تبدیل ہوتا اور مخروطی شکل میں وسیع ہوتا رہا۔ ذہن، فکر اور برتاؤ کی اس توسیع میں اُسے اپنے رنگا رنگ اور اکثر متضاد مشاہدوں اور تجربوں سے بھی مدد ملی۔ اس تصادم سے بھی جو تمنا اور تماشا کے درمیان جاری تھا اور ایسے ذی علم، ہمدرد دوستوں سے بھی جن پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ مثلاً مورخ برنی، شاعر امیر حسن، ناقد مولانا شہاب، شمس الدین دبیر، علما، قاضی اثیر، تاج الدین زاہد، بھائی علاء الدین علی شاہ وغیرہ اور ان میں سب سے بلند بالا، گمبھیر اور دل نواز شخصیت تھی خواجہ نظام الدین کی؛ جن سے خسرو کا واسطہ ایک زمانے تک دوستانہ رہا۔

تقدیر کا نہیں، دوستوں کا انتخاب خسرو نے خود کیا تھا، اس کی عاشقانہ، پرسوز فطرت اپنے معمر اور ہم مذاق دوستوں پر یہاں تک قربان تھی کہ بعض مشہور عاشقانہ غزلیں دراصل انہی

کی فُرقت میں کہی گئی تھیں ۔ مثلاً

مشکلے سخت است تنہا ماندن از دلدارِ خویش

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا

یا وہ دوہا: گوری سووے سیج پے، مکھ پے ڈارے کیس

شاعر کے کلام کی تہیں ٹٹولتے میں یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے ۔

۲ ۔ خسرو نے اگرچہ بچپن سے ہی مادرِ وطن کو چاہا، تاہم روکھی سوکھی روٹی اور چیتھڑے کی لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے، اپنی اپنی کچی دیواروں کے سائے میں تکیہ کرنے والے عام ہندستانی کی موقع شناسی، ذہنی رسائی اور ہنرمندی کی قدر کھُلی تب، جب انھوں نے سندھ و ملتان سے بنگال اور اودھ سے دکن تک کی خاک چھان لی ۔ جبر، لوٹ، غارت گری اور منصفانہ انتظام سلطنت کے فرق کو، اس کے اثرات کو، عام لوگوں کی فریادی یا شکر گذار آنکھوں میں سیاہ و سفید دیکھ لیا ۔

مثال کے طور پر "قران السعدین" اور "نہ سپہر" اہم واقعاتی مثنویوں کو غور سے دیکھا جائے تو دونوں کی تصنیف کے درمیان (۱۲۸۸ء تا ۱۳۱۵ء) ستائیس برس کا فاصلہ ہے ۔ لیکن یہ فاصلہ محض زمانی نہیں، ذہنی بھی ہے ۔ اوّل میں وہ باریک بیں مشاہد اور خوش کلام شاعر ہیں، مصرعے کھیلتے کودتے تیزی سے گذر رہے ہیں، ہر شئے جو برتی یا دیکھی اس کی خوب خوب تعریف کی؛ شب، شمع، شراب، ساقی، زنانِ مطربہ، موسمِ بہار و خزاں، خربوزہ و نبات پھر اس میں جا بجا دھوم مچاتی عاشقانہ غزلیں ہیں پوری اکیس ۔

"نہ سپہر" میں غزلوں کی تعداد صرف ۹ تک پہونچتی ہے ۔ اور "در مدح ہند" کے اشعار چار سو سے اوپر ۔ یہاں ویسی مدح نہیں بلکہ مناظرانہ لہجے میں سوچے سمجھے، برتے، پرکھے ہوئے ایک خطۂ زمین کی، مفتوح، مغلوب اور بے زبان ملک کی زبان کھلتی ہے اور طنز کرنے والوں کے منھ

پر گستاخ ہو جاتی ہے۔ شاعر اس سرزمین کے ذہن، ضمیر، زبان اور دین ایمان کی طرف سے ذرا نہ بول رہا ہے اور اس شدت میں محض جذباتی حدت نہیں، برسوں صیقل کئے ہوئے استدلال کا جوہر بھی بول رہا ہے۔

۳ ۔ خلجی دور کے اوّل ۲۵ برس بارہ سو روپے (ٹنکہ) سالانہ تنخواہ اور تھوڑے بہت انعام واکرام کے باوجود وہ معاشی حیثیت سے خوش نہیں رہے۔ تاہم یہی سیاسی استحکام کا، ان کی ذہنی آسودگی کا بہترین زمانہ ہے، اور اسی نسبت سے تصنیفی سرگرمی کا بھی مختصر مثنوی "مفتاح الفتوح" اور نثری جولانیٔ قلم "خزائن الفتوح" لکھ کر گویا انھوں نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی۔ لیکن اسی دور میں بعد کے پانچ برس جو دو طویل مثنویاں "دول رانی ..." اور "نہ سپہر" جان لگا کر لکھی ہیں، دونوں فرمائشی ہونے کے باوجود، بادشاہوں کے بجائے عام معاشرتی تہذیبی حالات کا، عصری ماحول کا، اور عام پیشہ وروں، ہنرمندوں، شہری، تاجروں، دیہاتی بندوں کی زندگی کا رنگین البم ہیں۔ دربار، کرسی، منصب، مقام ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ تلوار یا کدال کے بجائے قلم کی نوک سے روز کنواں کھودنا تھا، کھودتے رہے، روٹی اور رتبے کی پیاس بجھاتے رہے۔ لیکن روح کی پیاس، فنکار کے ضمیر کی پیاس انھوں نے اور طرح بجھانے کی تدبیر کی۔ "خمسہ" اور واقعاتی شاعری میں اصل موضوع سے ہٹ کر جوہرِ طبع دکھایا اور غزلوں میں عاشقانہ امنگوں کو موسیقی کی آنچ دے کر جی ٹھنڈا کیا۔ یہاں تک کہ مثنویوں میں جابجا غزلیں ملا دیں۔

۴ ۔ خسرو کے یہاں مرکزی نقطہ عشق "ہے، عشق ہزار شیوہ" جو سرزد اور سرکش ہو۔ تصوّف اسی عشق کی بے نہایت، بے کنار، اور بے در و دیوار توسیع ہے۔ تصوف نہ ان کا مشغلہ ہے، نہ پیشہ نہ نقاب ہے، نہ تکیہ۔ بلکہ ایک روحانی کیفیت ہے جو زلف و رخسار سے ہوتے ہوتے تمام عالمِ وجود کے حسن اور دلکشی کی ہمراز اور دمساز بن چکی ہے۔ جب یہ کیفیت ان کی غزلوں میں بس چکی تب انھوں نے غزلوں کو دیوان کی شیرازہ بندی میں راہ دی اور پھر غالباً خود ہی پہلے کے تین دیوانوں میں بھی پچھلی غزلیں شامل کر لیں۔[۹۹]

۵ ۔ عموماً شاعری کا رچا ہوا ذوق یا اس کی مشق اچھی نثر لکھنے میں کار آمد ہے مگر امیر کے شاعرانہ ولولے اور بے پناہ صلاحیت نے نثر کا راستہ کاٹا ہے۔ وہ نثر کے کئی اسلوب اپناتے ہیں، گناتے ہیں، لیکن ان کی نثر نے ہندستان میں فارسی نثر کی اٹھان کو اتنا ہی صدمہ پہونچایا جتنا ان کے نظریۂ

شاعری نے یہاں شاعری کا لہو گرمایا۔

۶۔ امیر خسرو کے نزدیک شاعری کا رتبہ موسیقی سے اور نظم کا درجہ نثر سے بلند تر ہے۔ جس کی ایک دلیل یہ کہ موسیقی بغیر لفظِ موزوں صرف "ہاں ہاں وہوں" رہ جاتی ہے اور نثر میں تو نظم (برائے آرائش) آجاتی ہے لیکن نظم میں نثر نہیں لاتے۔ نظم کے متعلق ان کا خیال ہے کہ

ہر کہ — غم قفل نہد بر دلِ بے حاصل او
جز زبانِ شعر انیست کلیدِ دل او

البتہ علم ہے جسے شعر پر انھوں نے ترجیح دی اور کہا کہ بہت سے علما گذرے ہیں جنھوں نے اپنے جلوۂ علم پر شعر کا پردہ ڈال رکھا تھا اور "فروترین پایۂ ایشاں شعر بود......" حدیث رسول "ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا" سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ حکمت و فلسفہ شاعری کا ایک حصہ ہے اور جادوگری "سحر را از بیان فرمایند نہ بیان را از سحر....."

— یعنی دراصل فلسفہ، علوم عقلی اور کمالات سب اس شاعری کے دامن میں آجاتے ہیں، جو غیبی قوت ہے، اور اسی معنی میں فکری شاعر "یزداں سے تعلیم پایا ہوا ہے"۔ وہ شاعری کے مقام کو مال ومنال اور شان وشکوہ سے برتر قرار دیتے ہیں۔ "شاہنامہ" عنوان کی ایک مختصر مثنوی میں کہتے ہیں۔

سکندر تہی داشت از خضر جام
نظامیش داد آبِ حیوان بکام
کلاہِ کیانی تہ خاک ماند
ہمیں نظم فردوسی پاک ماند (۱۰۰)

انھوں نے علم طب کی اصطلاحوں اور علم منطق کی چار شکلوں کو شاعری پر لاگو کیا اور دکھایا کہ شکل اوّل "یابس" ہے یعنی وہ شاعری جس پر لفظی صنعتوں (لفاظی) کا غلبہ ہو۔ شکل دوم "معتدل" ہے، یعنی وہ کلام جس میں لفظی مناسبات کی بھرتی نہ ہو اور سلاست ٹپکے۔ شکل سوم "رطب" یا مرطوب ہے، یعنی وہ جو حسنِ بیان اور معنویت میں سہل ممتنع کے درجے کو پہنچ جائے۔ شاعری کی چوتھی شکل ہے "محرق"۔ — وہ کلام جو قائل (شاعر) کے "درونِ سوختہ" سے بے ارادہ لاوے کی طرح ابل پڑے،

"د شعلہ در می زند"

"...... ایں شراب روحانی است و در کاسۂ سرِ شاعر نگنجد، و ادراک لذت آں نیز وجدانی است....."

وہ اپنے کلام میں اسی شراب روحانی کے آرزو مند ہیں جسے پانچ صدی بعد ان کے سچے وارث میرزا غالب دہلوی نے یوں کہا:

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

شاعری کے پانچ مقامات گنائے ہیں: فاضلانہ، حکیمانہ، نیکو طبعانہ، عاشقانہ — اور شاعرانہ پانچویں مقام میں چاروں جمع ہیں، مطلب یہ کہ علم و فضل، ذوق و فہم، نیک طبعی اور عاشقانہ "سوز" کے علاوہ فطری شاعری ہے جو شعر کا تقاضہ پورا کرتی ہے۔

امیر خسرو نے خود شعر کا تقاضا پورا کر دیا اور ایسی میراث چھوڑ گئے جو ان کے بعد ہندستان کے فارسی اردو ادب کو زینہ بزینہ پہنچتی رہی۔

ملک محمد جائسی، رحیم خانخاناں، ابوالفضل، نظیری اور بیدل، سید انشا اور نظیر سے یہ روش میر و غالب تک پہنچی، اقبال پر آکر تھمی۔ تھمی ہے ٹوٹی نہیں — اور ٹوٹے گی بھی نہیں۔ اس پر امیر خسرو کا سایہ ہے

حوالے اور حاشیے

۱۔ حسن سجزی دہلوی کے حالات خود ان کے دیوان کے علاوہ "غرۃ الکمال" کے دیباچے اور دوسرے تذکروں سے ظاہر ہیں مولانا شبلی نے "بیان خسرو" میں حسن کو جونانبائی کی دوکان پر روٹی تول تول کر بیچتے دکھایا اور ایک رومانی مکالمے کے بعد خسرو اور حسن کے درمیان عشق کی پوری داستان سناڈالی۔ اس کا سرچشمہ نظام الدین احمد کا تذکرہ "طبقات اکبرشاہی" اور ہندو شاہ فرشتہ کی تاریخ "گلشن ابراہیمی" (تالیف ۱۶۰۹) معلوم ہوتے ہیں۔

۲۔ خود امیر خسرو کا بیان ہے کہ اُن کے وقت میں پائے تخت میں اتنے سارے شاعر جمع تھے کہ جس پتھر کو اٹھاؤ، اس کے تلے ایک شاعر برآمد ہو (دیباچہ دیوان سوم و رسالہ اعجاز خسروی)

۳ "اصل تاریخ فیروز شاہی"۔ کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۳۵۹

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ امیر کی زندگی کا پس منظر جاننے کے لئے تغلق دور کے شاعر عصامی کی مثنوی "فتوح السلاطین" (جو اس نے دکن میں جاکر لکھی) اور آذری کی "جواہر الاسرار" (جو پندرھویں صدی میں مرتب ہوئی) بھی مفید ہے۔ اگرچہ ان دونوں اہم تصانیف کا براہ راست ہمارے موضوع سے تعلق نہیں۔

۳ب تیسرے ذریعے میں بہتر ہوگا کہ دیوگری کے راجکمار ہردیو کی اس ڈائری کو بھی شامل کرلیں جسے خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے حاشیوں کے ساتھ "نظامی بنسری" کے نام سے شائع کیا تھا اور اب اصل کا ترجمہ بھی پاکستان سے شائع ہوگیا ہے۔

اس ہم عصر مصنف نے جو دہلی آکر خواجہ نظام الدین کا مرید اور دہلوی ہی ہوگیا تھا بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے امیر خسرو کے ذاتی اور ان کی دہلی کے سماجی حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۴۔ ایک بار سے زیادہ امیر نے جتایا ہے کہ اُن کے کلام کی تصحیح میں، ترتیب میں اور مشورے دینے میں ان کے ذی علم دوستوں کا ہاتھ رہا ہے۔ مہرہ کے بارے میں کہتے ہیں:

من بدو عرض کردہ نامۂ خویش   او بہ اصلاح راندہ خامۂ خویش

دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم   رنج بر خود نہاد و منّت ، ہم

۵ ۔ ملاحظہ ہو تفصیل اور شمارہ کمیاب نسخوں کا: ظ انصاری مطبوعہ بروشر اکتوبر ۱۹۷۵ ۔ رسالہ D.A.V.P. حکومت ہند نئی دہلی۔

۶ ۔ حوالہ ۔ نواب علی یاور جنگ کے پیش لفظ Forward میں جو انگریزی کی یادگاری جلد ۱۹۷۵ء Time, Life and works of Khusrau میں شامل ہے۔

۷ ۔ ملاحظہ ہو "امیر خسرو کے عہد میں دہلی کا سیاسی سماجی افق" از ڈاکٹر اطہر عباس رضوی شامل یادگاری جلد مجموعہ مضامین انگریزی ۱۹۷۵ء مطبوعہ لیڈرز پریس بمبئی ص۲۱ As above.

۸ ۔ سب سے اہم مخطوطے برٹش میوزیم ، انڈیا آفس (لندن) ، لینن گراد ، تاشقند ، استانبول اور ڈبلن میں محفوظ ہیں ۔ ملاحظہ ہو D.A.V.P. کا بروشر "امیر خسرو" (انگریزی ، ہندی ، اُردو) حکومت ہند ۔ اشاعت ۱۹۷۵ء نئی دہلی ۔

۹ ۔ تاجیکستان اور ازبکستان میں خسرو اسٹڈی سرکل قائم ہیں اور سوویت یونین میں خمسہ خسرو کی پانچویں مثنویوں پر الگ الگ سات فاضلوں نے تحقیقی مقالے لکھے جن میں غضنفر علیف ، جعفر افتخاروف ، طاہر محرموف ، میر جمال میر سعیدوف اور وفا بقایف (مرحوم) شامل ہیں ۔ پانچوں جلدیں ماسکو سے شائع ہو گئی ہیں ۔ علمی و انتقادی متن اکادمی شبین بابا جان غفوروف اور ظ انصاری کے زیرنظر تیار ہوئے ہیں ۔

۱۰ ۔ معز الدین کیقباد ، جلال الدین فیروز خلجی ، علاء الدین خلجی ، قطب الدین مبارک شاہ ، غیاث الدین تغلق ۔

۱۱ ۔ قران السعدین ، مفتاح الفتوح ، دُول رانی خضر خاں ، نُہ سپہر ، تغلق نامہ ۔

۱۲ ۔ تحفۃ الصغر ، وسط الحیوۃ ، غرۃ الکمال ، بقیہ نقیہ ، نہایۃ الکمال ۔

۱۳ ۔ مطلع الانوار ، شیرین وخسرو ، مجنون و لیلی ، آئینۂ اسکندری ، ہشت بہشت

۱۴ ۔ ملاحظہ ہوں ۔ بیان دولت شاہ سمرقندی ص۲۴۰ مجالس العشاق ص۲۳۲ تا ۱۳

۱۵ ۔ یہ کتاب آج تک محض ایک بار نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اور اب کمیاب ہے

۱۶ ۔ دہلی، سلطانہ، ملتان، اجودھیا (اودھ) لکھنوتی (بنگال)

۱۷ ۔ ملتان، رنتھمبور، دیوگیری، چتوڑ، ترہت۔

۱۸ ۔ معانی و بیان، موسیقی، نجوم، فلسفہ، سپہ گری۔

۱۹ ۔ ہندوی (یعنی کھڑی بولی برج اور اودھی) پنجابی، سنسکرت، فارسی، عربی۔

۲۰ ۔ فاطمی خلافت (شمالی افریقہ) اور خلافت عباسیہ مغربی ایشیا کی شکست اور تباہی کے بعد اس صدی میں ایک طرف منگول "زریں خیل" کی یلغار ویانا سے انڈونیشیا تک اور سلطنت شمالی سائبریا سے مغربی ایشیا کے ساحلی علاقے تک اور دوسری طرف دہلی سلطنت کوہ ہندوکش سے رامیشورم تک باقی رہی۔ خلجی دوم نے چنگیزی لشکروں کی "ناقابل شکست" قوت کو دہلی کی فصیل سے پسپا کر دیا۔ اور یوں ہندستان کی سیاسی سالمیت اور تہذیبی رنگارنگی کے نشان محفوظ رکھے۔

۲۱ ۔ ۱۲۹۹ء میں جب منگول تاتار سردار قتلغ خواجہ کی سرکردگی میں (بقول بعضے) دو لاکھ کے لشکر نے دہلی پر یلغار کی اور "کیلی" میں مورچہ جمایا تو علاء الدین خلجی پائے تخت سے باہر نکل آیا اور شہر کو بربادی سے بچانے کے لئے فیصلہ کیا کہ یہ جنگ باہر لڑی جائے اور اگر شکست کا سامنا ہو تو کوتوال شہر چابیاں حملہ آوروں کے حوالے کر دے تاکہ عوام کے جان و مال کو گزند نہ پہنچے۔ ہفتوں یہ فوجیں آمنے سامنے کھڑی رہیں۔ علاء الدین کا خیال تھا کہ دشمن کی صفوں کے پیچھے ہمارے حلیف اور ہماری چھاونیاں موجود ہیں اور جتنا وقت گزرے گا ہماری طاقت بڑھتی جائے گی۔ ہندستانی فوجی بساط پر نئی پالیسی نے پانسہ پلٹ دیا اور حملہ آور لشکر خود بخود پسپا ہو کر تاریکی میں نکل گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر سکینہ جامع تاریخ ہند (انگریزی) جلد ۵ ص ۳۴۰ ۱۹۷۰ء

A comprehensive History of India vol. V page 340

۲۲ ۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف "ہندستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں" ص ۳۱-۲ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا ۱۹۷۴ء۔ جا بجا اس علمی تصنیف میں امیر خسرو کے کلام سے ثبوت دیے گئے ہیں۔

۲۳ ۔ اکادیمی شئین غفوروف "تاجیکی" (بزبان روسی) ناؤ کا پبلشرز۔ ماسکو ۱۹۷۲ء۔

۲۴ ۔ وو، بارتولد تصانیف "ترکستان منگول یلغار کے زمانے میں" ص ۵۴۵ جلد اول ماسکو

۲۵ - م. گ. پیکولین "چنگیز خاں افغانستان میں" مضمون (بزبان روسی) ص۳۵-۴۴ تصنیف "تاتار منگول ایشیا اور یوروپ میں"۔ ماسکو۔ ۱۹۷۰ء

۲۶ - یہ مقام ضلع ایٹہ کی تحصیل ہے اور چھوٹی لائن پر کاسگنج سے دو اسٹیشن آگے۔ قائم گنج سے دو میل پر اب بھی آباد ہے۔ راقم السطور نے وہاں ایک بہت قدیم باولی (کنواں) اور برگد کا ایک پرانا درخت دیکھا جن کی عمر سیکڑوں سال بتائی جاتی ہے۔

۲۷ - دیباچہ غرۃ الکمال۔

۲۸ - اَودھی اور بَرج، دونوں کے کلاسیکی اَدبی نمونے کھڑی بولی سے بہت پہلے کے موجود ہیں۔ کھڑی بولی کو یہ رُتبہ ملا فارسی کے سائے میں۔

۲۹ - دیباچہ تحفۃ الصِغر

۳۰ - اسی نام سے ایک دیوان پہلی بار دہلی سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ مُستند نہیں۔ ملاحظہ ہو یادگاری جلد میں (انگریزی) مضمون منال شاہ القادری (کلکتہ)

۳۱ - تاریخوں میں یہ واقعہ مزے لے لے کر بیان ہوا ہے کہ ۴۰ سال پہلے شمس الدین التتمش نے بلبن کو اس کی بدصورتی کے سبب خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس کی التجا اور اللہ کے نام پر خرید لیا۔ دراصل دہلی سلطنت کی بنیاد اسی بلبن نے مضبوط کی۔

۳۲ - پروفیسر محمد حبیب "سوانح حیات امیر خسرو" اُردو ترجمہ حیات اللہ انصاری۔ ہندستانی اکیڈمی۔ الہ آباد۔ ۱۹۴۸ء

۳۳ - ضیاء الدین بَرنی "تاریخ فیروز شاہی" ص۱۱۲ ایشیاٹک سوسائٹی۔ بنگال۔

۳۴ - آچاریہ برہسپتی مضمون "مسلمانز اینڈ انڈین میوزک" (انگریزی)

Journal of Indian Musical Society June 1975, Baroda

۳۵ - ایشوری پرشاد (انگریزی) "تاریخ ہند" ص۹۶ الہ آباد۔ "تاریخ فرشتہ"، جلد اول (اُردو) ص۱۳۴ نول کشور پریس لکھنؤ۔

۳۶ - صباح الدین عبدالرحمٰن "بزم مملوکیہ" ص۲۸۴ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

۳۷ - "سر جاندار" کو عموماً شاہی محافظ دستے کا سردار (چیف آف کیڈٹ کور) لکھا گیا ہے

لیکن بعض مقامات پر، مثلاً فرشتہ نے (ص ۱۴۳) اور Ravety نے سرجامہ دار" لکھا ہے" طبقات ناصری" ترجمہ و دیباچہ ص ۶۰۳

۳۸۔ عشیقہ "دودل رانی خضر خاں" (نسخہ قلمی ۱۰۶۳ھ ۔ ۵۲-۱۶۵۲ء)

۳۹۔ پروفیسر محمد حبیب مذکورہ بالا ص ۱۶

۴۰۔ تاریخ فرشتہ مذکورہ بالا جلد اوّل ص ۳۵

۴۱۔ دیباچہ، غرۃ الکمال" قران السعدین" ص ۱۸۱ (مطبع حسنی میر حسن رضوی) مطبوعہ ۱۲۶۱ھ:

یک جو از یں فن چو بدامانِ نہم
دہ کنم آں را و بصد تن دہم

(اس فنِ شاعری سے جب میرے دامن میں ایک جو برابر رقم آتی ہے، تو اسے دس گنا کر کے سیکڑوں آدمیوں میں بانٹ دیتا ہوں)

۴۲۔ مثنوی کے خاتمے میں صاف کہا ہے کہ جتنے موتی میں نے روے ہیں، یہ زر کی دو، تین تھیلیوں کے عوض نہیں دیے جاتے۔ شاہانِ ایران کا خزانہ بھی اگر مجھے دیا جائے تو وہ ایک حرف کا صلہ ہوگا، بلکہ اس سے بھی کم۔ میں تو نام بلند" کی خاطر یہ کام کر سکا اور بس۔

۴۳۔ ایضاً دیباچہ ....

۴۴۔ معز الدین کیقباد نے خواہش ظاہر کی تھی کہ نئے شہر کا نام ایسا رکھا جائے کہ بادشاہ اور خدا دونوں اس میں شریک ہوں، چناں چہ "کے" (کیقباد) "لوک" (عوام)، اور "ہری" (خدا) کے جوڑ سے "کیلوکھری" لفظ بنا اور یہی نام رکھا گیا۔ امیر خسرو نے اسے "کلوکھری" باندھا ہے۔

۴۵۔ ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالحی حبیبی (افغانستان) کا عالمانہ مضمون Khiljis are afgans یادگاری جلد انگریزی میں شامل ہے۔

۴۶۔ یہ منگول لفظ روسی میں "دنگی"، اُردو میں "تنخواہ" ہندستانی اور بنگالی میں "ٹکہ" بن گیا ہے۔

۴۷۔ پہلے لکھا تھا۔ صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست
آسماں روئے بلک ہیچو نمود

اور اب دس گیارہ سال بعد "مفتاح الفتوح" میں لکھتے ہیں۔

ہمہ کردند بہر بندگی جہد
مگر میر کٹرہ بجوئے بدعہد

۴۸ ۔ یہ مقام ویسٹرن ریلوے کے اسٹیشن سوائی مادھوپور کے نزدیک ہے۔

۴۹ ۔ اکادمی شین غفوروف "تاجیکی" مذکورہ بالا ص ۴۶۲

۵۰ ۔ تاریخ فرشتہ، مذکور ص ۱۵۰ (اردو)

۵۱ ۔ "این نظم غیر نیست کہ شہنامۂ من ست India office Ms 1187 بحوالہ وحید مرزا (اردو) ص ۱۴۷-۱۴۹

۵۲ ۔ البقیہ نقیہ" وخزائن الفتوح"

۵۳ ۔ بیک دست آہن ابیک دست زر ازیں تاج داد و ازاں برد سر

۵۴ ۔ ملاحظہ ہو حوالہ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی۔ یادگاری جلد (اردو) کا دوسرا مضمون مطبوعہ دہلی۔

۵۵ ۔ "چینی" لشکر کا ذکر امیر خسرو کے ہاں کم از کم تین بار آیا ہے۔ کاشغر اور یارقند کے راستے سے جہلم پار اترنے والے حملہ آوروں میں عموماً منگول تاتار اور چینی شامل ہوتے تھے۔ اوئی گور، غز اور قزاق آج بھی چینی روسی ایشیا میں آباد ہیں۔ امیر نے حملہ آور منگولوں کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ بھی ان مغربی چینیوں سے ملتا جلتا ہے۔ بعض موقعوں پر "چینی" نقاش اور ہنرمند کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو "آئینہ اسکندری"۔ "چینی غلام وکنیز کا بھی رواج تھا (اعجاز خسروی)

۵۶ ۔ "خزائن الفتوح"، ص ۴۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۲۷ء

۵۷ ۔ یہ سلسلہ ہندستان میں خواجہ معین الدین چشتی (اجمیری) سے چلا (وفات ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء) ان کے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی (وفات ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء) تیسرے بابا فرید الحق گنج شکر جن کی تاریخ وفات دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء اور مولانا علی ندوی نے تاریخ دعوت وعزیمت میں ۶۷۰ھ ۱۲۷۱ء لکھی ہے۔ خواجہ کاکی نے عالم وجد میں وفورِ شوق سے جان دی۔ باقی خلفا نے طویل عمریں پائیں۔

۵۸ ۔ "سوانح حیات امیر خسرو" پروفیسر محمد حبیب (اردو ترجمہ) ص ۳۷-۳۸۔ ہندستانی اکیڈمی۔ الہ آباد۔ ۱۹۴۸ء

۵۹ ۔ ذاتی طور پر راقم السطور کو "مطلع الانوار" زیادہ پسند ہے لیکن طبع زاد مضامین کے اعتبار سے "شیریں وخسرو"، "اور ہشت بہشت" کا درجہ بلند ہے : ملاحظہ ہو آذربائیجانی خسرو شناس طاہر اوغلی محمود ف کا مضمون (انگریزی) یادگاری جلد ۵، ۱۹۷۵ء میں پانچ سو برس پہلے میرک نقاش، بہزاد اور قاسم علی نے اس مثنوی کو اپنی مصوری کو موضوع بنایا تھا۔ تب سے رواج چل پڑا۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر زرین اکالے کا مضمون (انگریزی یادگاری جلد میں)۔

۶۰ محفل سماع اور قوالی کا رواج خواجہ اجمیر کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا اور ان میں سنائی، رومی (شمس تبریز)، اور سعدی کی غزلوں کے بعد اب خسرو کی غزلیں گائی جانے لگی تھی ۔ صاحب حیثیت لوگ یہ محفلیں کراتے تھے اور ان میں مسلم وغیر مسلم خاص وعام شریک ہوتے تھے، لیکن مشائخ چشت کی محفل سماع پر تین شرطیں عائد تھیں : زمان، مکان، اخوان یعنی وقت مناسب، مقام پاکیزہ اور سکون قلب کا، اور حاضرین اہل ذوق ہوں۔ پھر یہ کہ یہاں مزامیر (ساز) استعمال نہ کیے جائیں ۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر سید حسین قادری، " امام غزالی کا فلسفہ مذہب واخلاق" ندوۃ المصنفین۔ دہلی ۱۹۶۱ء

۶۱ ۔ حافظ محمود شیرانی۔ تبصرہ بر خزائن" ص۲۵ اورنٹیل کالج میگزین ۱۹۲۵ء لاہور۔ یہ نام تین طرح سے مذکور ہوا ہے : آنایک، ملک مانک، نایک۔ ان میں ملک مانک، زیادہ قرین قیاس ہے۔

۶۲ ۔ پروفیسر بنارسی پرساد سکسینہ "حسن براد و" کا مسئلہ :

A comprehensive History of India vol. V 1970

مصنف نے 'براد و' 'برادری سے بحث کرتے وقت بتایا ہے کہ (الف) یہ لوگ محض گجرات تک محدود نہیں، سارے ہندستان میں پائے جاتے ہیں (ب)، برادو، براؤ، پروار سب ایک لفظ کی شکلیں ہیں، (ج)، یہ بڑی سرفروش جاتی ہے (د) حسن برادو کا گجرات سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ راقم السطور کو 'برودہ' کی کسی قدیم تاریخ کے کاغذات سے پتہ چلا تھا کہ شہر" برودہ " (وڈودرہ) کی اصلیت میں یہی برادو ہے اور برادو برادری میں اب تک لواطت (اغلام) کا چلن ہے۔ انھیں جرائم پیشہ قبیلے میں شمار کیا جاتا ہے ۔

۶۳ ۔ تاریخ عالم کا طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جن شخصیتوں نے تاریخ کے سینے پر کامیابی کے یا کسی نئی پالیسی پر عملدرآمد کے نشان چھوڑے ہیں انھیں سیاسی اقتدار کے کم از کم بیس۲۰ سال غرور نصیب ہوئے۔ التتمش ناصرالدین محمود، بلبن اور علاءالدین خلجی کا زمانہ اس کا شاہد ہے۔

۶۴ ۔ انڈیا آفس مخطوط ۱۱۷، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا۔

۶۵ ۔ شمال سے پناہ گزیں شہزادوں اور سپہ سالاروں کے خزانے اور جنوب سے راجاؤں اور مندروں کے خزینے دہلی کی طرف امنڈنے کے کارن قوتِ خرید بڑھی، پیداوار اس نسبت سے نہیں بڑھ سکی۔ نتیجہ یہ کہ قیمتوں کے اضافے نے چور بازاری اور تجارتی بدعنوانی پھیلادی۔

۶۶ ۔ ترجمہ: وہ جو قبضہ کرے مگر اسے رکھ نہ سکے، وہ قبضہ اس کے گلے پڑ جاتا ہے اور لازم ہے کہ سب لوگ اس (فاتح) کی گرفت کریں، یہاں تک کہ احتجاج کی یہ آواز دنیا میں پھیل جائے۔

۶۷ ۔ فارسی میں "نصائح" کا یہ سلسلہ نظام الملک طوسی اور غزالی (کے ترجمے) سے شروع ہوا، نظامی نے بھی اسے اختیار کیا۔ امیر نے "قران السعدین" "عشیقہ" اور "نہ سپہر" میں خصوصیت سے اپنایا اور خمسہ کی مثنویوں میں جابجا "درحدیثِ دیگراں" کام نکالا۔

۶۸ ۔ ترجمہ: ترکوں کی طرح نشانہ باز بنو کہ بال کی کھال نکال کر رکھ دو۔ میری طرح قصیدہ گوئی میں مت پڑنا، میں تو ہر وقت جھوٹ موٹ کے قصے تراشا کرتا ہوں۔

۶۹ ۔ ملاحظہ ہو مضمون: نثار احمد فاروقی "نیا دور" لکھنؤ امیر خسرو نمبر دسمبر ۱۹۷۴ء اور ڈاکٹر بروس لارنس (یادگاری جلد انگریزی) ۱۹۷۵ء

۷۰ ۔ افضل الفوائد ص ۱۰-۹ کتب خانہ نذیریہ۔ دہلی ۱۹۶۴ء

۷۱ ۔ اصحابِ صفہ سے مراد رسول اللہ کے وہ صحابی جو اسباب دنیا سے بالکل بے نیاز رہ کر اپنے مشن کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

۷۲ ۔ ملاحظہ ہوں شہاب سرمدی کے ۳ مضامین خسرو اور موسیقی کے تعلق سے جو اس موقع کی مناسبت سے شائع ہونے والی بمبئی اور دہلی کی تین کتابوں میں شامل ہیں

اور اپنے موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

۷۳۔ یہ کمیاب کتاب نئے طرز پر علمی و انتقادی متن کے ساتھ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی (ہندستان) کی طرف سے شایع کرنے کا پروگرام ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں اس پر کام ہو رہا ہے۔

۷۴۔ غلطی سے اسے "عشقیہ" یا "خضر خاں دُول رانی" لکھ دیا جاتا ہے، حالانکہ خود امیر نے تاکید کی ہے کہ اسے "دُول رانی، خضر خاں" یا "عشیقہ" کہا جائے (۱۵، ۵) تعداد اشعار ۴۵۱۹۔

۷۵۔ ترجمہ: ہندو رسم کے مطابق ماں باپ کی طرف سے اس کا نام "دیول دی" تھا مگر چونکہ اس پری کے نام میں 'دیو' کی پیچ بھی تھی، میں نے وہ منتر پھونکا کہ دیو کا اثر نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ ایک ترکیب اور کی کہ 'دیول' کے لفظ کو 'دُول' بنا دیا کیوں کہ یہ لفظ عربی میں دولت کی جمع ہے، منشا یہ کہ اس نام میں کئی ایک دولتیں جمع ہو جائیں (اور دولت میں مال کے علاوہ حکومت کا مفہوم پوشیدہ ہے)۔ رانی کو دولت بھی حاصل تھی مراد بھی، اس لیے میں نے دُول کو رانی سے جوڑ کر یہی نام دیا۔ اب اس کتاب عشق کا خطاب دنیا میں یہی ٹھیرا۔ دُول رانی خضر خاں، اور پھر، جس طرح "لیلے مجنوں" کا نام ایک ساتھ چلتا ہے، ایسے ہی دول رانی اور خضر خاں کی ترتیب قائم رہے گی۔

۷۶۔ ترجمہ: بیٹی، تیرا چہرہ میرے دل کے لیے چراغ ہے۔ دل کے باغ کا سب سے اچھا میوہ۔ اگرچہ تیرے بھائی نیک اور سعادت مند ہیں، مگر میری نظر میں ان کی حیثیت تجھ سے بہتر نہیں . . . .

۷۷۔ ملاحظہ ہو طاہر اوغلی محرموف کا مضمون مذکور، جس کا محض خلاصہ شامل ہے اور میرا مضمون "امیر خسرو کے ہاں نسوانی کردار"۔

۷۸۔ پروفیسر عابد علی عابد مرحوم نے اپریل ۱۹۵۹ء کے سہ ماہی "اقبال"، لاہور میں مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ تصوف کا نظریہ یورش تاتار سے پہلے کا ہے۔ ایرانی فاضل عباس اقبال اپنی تاریخ مفصل ایران" میں لکھتے ہیں کہ سلاجقہ روم اور خوارزم شاہیوں کے زمانے کے عرفاء

صوفیا شیخ محی الدین ابن عربی، مجدد بغدادی، نجم الدین کبریٰ، اور شہاب الدین سہروردی وغیرہ منگول حملے اور ایران و عراق کی بربادی سے پہلے ہی اپنا پیغام عام کر چکے تھے۔ میں نے یہاں بھی "ردّ و قبول" کے لفظ اصطلاحی معنوں میں لیے ہیں اور تصوف کو انسانی تہذیب کے ارتقا میں "قبول" کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔

۷۹) ۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۹۰ میں یہ واقعہ ۸ محرم ۷۱۷ھ (۲۴ ۔ مارچ ۱۳۱۷ء) کا لکھا گیا ہے لیکن امیر خسرو نے "نہ سپہر" میں اور شاعر عصامی نے "فتوح السلاطین" میں ۲۴ محرم ۷۱۶ھ درج کی ہے۔

۸۰ ۔ ترجمہ : بے انتہا، بیش قیمت خزانے میں اسے اتنے عطا کروں گا کہ وہ ہاتھی پر لادا نہ جائے بلکہ ہاتھی کے ہم وزن ہو۔

۸۱ ۔ ترجمہ : اے بادشاہ، خزانہ عطا کرنے والے، کرم فرمانے والے، معانی شناس اور سخن پرور بادشاہ۔ اب میری عمر، جو ساٹھ سے اوپر جا چکی ہے، تمام کی تمام عالی شان بادشاہوں کی خدمت میں گزری۔ قسمت نے یاوری کی اور میں بندگی کر کے چار تخت نشینوں کی خدمت میں کمر بستہ رہا۔ اب جب کہ اقبال مندی نے میرا ساتھ دیا ہے تو قطب عالم شہنشاہ قطب الدین مجھ پر مہربان ہو گیا۔ اے بادشاہ، میں نے تجھ سے جو بخشش پائی، وہ پہلے کے بادشاہوں سے میسر نہ آئی تھی۔

۸۲ A comprehensive History of India vol. V Page 434

۸۳ ۔ ترجمہ : میں نے فتح کی مشکل کو یوں سلجھایا کہ جنگ ارنگل کی تفصیلات جاننے والوں سے معلومات حاصل کیں۔

۸۴ ۔ "نہ سپہر" صفحہ ۹۴ ترجمہ : ہر ایک پردے پر اتنی سیدھی، بے عیب تصویریں کڑھی ہوئی تھیں جیسے شاعر کا خیال اور فلسفی کا ذہن۔ حسن نے ہر طرف ایسے جلوے بکھیر دیے تھے جو خواب و خیال میں نہیں گزرتے۔

۸۵ ۔ عہد خسرو کی موسیقی میں جو ساز استعمال ہوتے تھے، ان کا بیان تصاویر کے ساتھ ایک ہمعصر کتاب "غنیاۃ المنیہ" میں محفوظ ہے، جو اپنے نامعلوم مگر ماہر فن مصنف کے

قلم سے ۱۳۰۵ء میں لکھی گئی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سمینار مخطوطات میں شامل ہے (ملاحظہ ہو شہاب سرمدی کا مضمون ترک ہندستانی موسیقی پر، یادگاری جلد ۵، ۶ء (انگریزی)

۸۶ ۔ البیرونی نے کتاب الہند میں تین مقامات پر ہندوؤں کے عقیدۂ توحید کو جھاڑ پونچھ کر پیش کیا ہے، مثلاً یہ بیانات :

ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے، جس کی نہ ابتدا ہے، نہ انتہا، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ (الحیّ والمحیّ)، اور زندہ کرنے والا ہے....

..... بت پرستی ہند و عوام کی ریت رسم (سنسکار) ہے، خواص ہند و اس سے بری ہیں...... اوم کلمۂ تکوین مسلمانوں کی بسم اللہ کا قائم مقام ہے.......

تینوں حوالوں میں البیرونی کا برتاؤ عالمانہ اور ہمدردانہ ہے (ص ۲۴، ص ۱۴۴، ص ۲۲۸ علی الترتیب) ترجمہ اشاعت انجمن ترقی اردو ۱۹۴۱ء ۔ دہلی

۸۷ ۔ "نہ سپہر" سپہر چہارم ص ۲۲۳-۲۸ اشاعت کلکتہ ۱۹۴۸ء

۸۸ ۔ سلطنت کے انتظام کی پانچ شرطیں اصل ہیں، جو توفیق الٰہی سے ہی کسی کو نصیب ہوتی ہیں ۔

۸۹ ۔ خسرو خاں اور حسام الدین دونو بھائی تھے ۔ بعض مورخین لکھتے ہیں (مثلاً فرشتہ اور برنی) کہ جب خسرو خاں کہیں فوج لے کر جاتا تو اس کی غیر حاضری میں حسام الدین بادشاہ کا پہلو گرم کرتا ۔ اس کے علاوہ حرم میں کئی مختلف نسلوں اور علاقوں کی عورتیں موجود تھیں ترجمہ : وہ تاجدار جو عیش و عشرت میں بسر کر دیتے ہیں، اپنی دور اندیشی کو عیاشی میں اڑا دیتے ہیں ۔ ہوشیار رہو بہروپ بھرے ہوئے دشمن کو دوستوں سے الگ پہچان لو ۔

۹۰ ۔ مشرقی برلن (GDR) کی اسٹیٹ لائبریری میں ۱۶ ویں صدی کا وہ قلمی نسخہ محفوظ ہے عبد الرحیم خانخاناں کے دور سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مغل بادشاہوں نے سبق سبق کر کے پڑھا اور اپنے دستخط ثبت کیے

Periach catalogue No. 8309

۹۱ ۔ برٹش میوزیم، مشرقی مخطوطات کے سیکشن میں خود جوناخاں (محمد بن تغلق) کی قلمی تحریر موجود ہے جس سے امیر کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے حوالہ

Rieu catalogue supplement . Add. 25,785
Page 315-17

۹۲ ۔ تاریخ فرشتہ صت ۱۹۹ (اردو)

ابن خلدون نے اپنے مقدمے، باب۔ چہارم Roulledge and Kegam Paul London

میں یہ قصہ سنایا ہے کہ ابن بطوطہ کی موت

کے کچھ عرصے بعد جب وہ اس کے وطن پہنچا تو وہاں کے لوگ شاہانِ ہند کی رسموں پر اور تقسیم مال پر (مثلاً کئی کئی مہینے کی پیشگی دیے جانے پر) ابن بطوطہ کے بیان کو محض ایک جہاں دیدہ ہم وطن کی من گھڑت سمجھتے تھے۔ کیوں کہ وہ اس قسم کے بادشاہوں کے متعلق بالکل بے خبر تھے۔

۹۳ ۔ یہ پہلا نہیں، تیسرا موقع ہے جب ہم خسرو کی زبانی "روسی" کی موجودگی سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مجنون لیلی میں "روسی" ظرائفِ عروسی کا قافیہ ہے، آئینہ سکندری میں "رومی و روسی" ساتھ آتے ہیں۔ شامی تاجروں، بلغاریہ والوں اور بحری قزاقوں کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ "روسی" موجود ہیں اور "تغلق نامہ" میں وہ باقاعدہ فوج میں شامل ہیں۔ یہاں بیان واقعہ میں ان کا نام آیا ہے۔

۹۴ ۔ مُعبر یعنی عبور کرنے (پار اترنے) کی جگہ ۔ یا گھاٹ ۔ اس لفظ کی آواز سے کئی مصنفوں کو ملابار کا گمان ہوا ہے۔ حالانکہ یہ تامل ناڈو کا ساحلی علاقہ ہے۔ خسرو نے مُعبر کے سفر میں جن مقامات کا نام لیا ہے۔ وہ تلنگانہ سے زمین کے آخری سرے پُل آدم تک تامل ناڈو میں ہیں۔ یہ فوج اراکاٹ سے گزرتی ہوئی جنوبی ہند کے آخری کنارے تک پہنچی تھی۔

۹۵ ۔ "امیر خسرو اور سبکِ ہندی" مضمون پروفیسر امیر حسن عابدی (اردو کی یادگاری جلد، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۵ء) یہ مضمون امیر کی فارسی دری میں ہندستانی الفاظ و محاورات کا جائزہ لینے کا پہلا قدم ہے۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ فارسی میں سبک ہندی کی بنیاد مسعود سعد سلمان سے پڑی اور امیر خسرو نے اسے سند یا نمونہ بنا دیا۔ شمس سراج عفیف کی تاریخ مبارک شاہی سے لے کر ابوالفضل کی آئین اکبری، نعمت خان عالی کے جنگ نامہ اور

غالب کی "دستنبو" اور "مہر نیمروز" تک یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ چلا ہے۔

۹۶ ۔ قادری سلسلے کے مرید شہزادہ دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیا" میں چشتی صوفی حمید الدین ناگوری (وفات ۶۷۳ھ) کے بیان میں لکھا ہے کہ :

"از خلفائے معین الدین چشتی ..... در ناگور ؒ ۔ طناب
زمین احیائی داشتند و آں را بدست مبارک خود زراعت
می کردند و قوت عیال می ساختند ص۹۴

اشاعت نول کشور پریس (لکھنؤ)

۹۶ب ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تالیف "تاریخ دعوت و عزیمت" (حصہ سوم) کے صفحات ۹۰۔۱۱۵ پر تصوف کے اس پہلو سے بحث کی ہے۔ اور خلیق احمد نظامی نے "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان دونوں کتابوں کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔

۹۷ ۔ "Madura Madras District Gazettee 1906" کے مصنف لکھتے ہیں کہ پانڈیا خاندان کے وارثوں میں تخت نشینی پر نزاع ہوا اور ایک دعویدار نے علاء الدین خلجی سے مدد مانگی۔ علاء الدین نے ملک کافور کی سرکردگی میں ۱۳۱۰ء میں فوج بھیجی جس نے راستے کا تمام علاقہ فتح کر کے زبردست سیاسی تبدیلیوں کو راہ دی اور بڑھتے بڑھتے رامیشورم پہنچ کر ایک مسجد کی بنیاد ڈالی ..... سندریشور اور میناکشی کے دو مندر اور ان کے گرد کی عمارتیں محفوظ رہیں، باقی تمام علاقہ تاخت و تاراج ہو گیا۔ ۴۸ برس تک یہاں مسلم حکمران یا ان کے باج گزار حکومت کرتے رہے۔

۹۸ ۔ چوتھے دیوان "بقیہ نقیہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "اصحاب طبع" کو معلوم ہو کہ مرتبہ اوّل وہ غزلیات ہیں جو مٹی کی طرح ٹھنڈی، خشک اور کثیف ہوتی ہیں۔ ان میں خشک صنائع بدائع کا استعمال ہوا ہے اور یہ پستی کی طرف مائل ہیں۔ بچپن میں اس طرح کی شاعری کی۔ خاک اڑائی اور ہر قسم کے شاعرانہ تجربے کر ڈالے۔ اس دیوان کا نام "تحفۃ الصغر" ۔

مرتبہ دوم میں وہ غزلیں جو پانی کی طرح صاف ستھری اور گرم و تر، جنھیں طبیعت کی آنچ پہنچی۔ دیوانِ "وسط الحیوۃ" میں ان کی مثالیں ملیں گی۔

مرتبہ سوم میں ہوا کی طرح، پانی سے زیادہ لطیف، رواں غزلیں۔ دیوانِ "غرۃ الکمال" کی غزلیں ایسی ہیں۔

مرتبہ چہارم میں آگ بھری غزلیں، شعلے اوپر کی طرف اٹھتے ہیں، ان میں پستی کو راہ نہیں ملتی۔ یہ وہ کلام ہے جو نرم طبیعتوں میں یوں سلگتی ہیں جیسے روئی میں آگ۔ لوہے کے دل ان سے موم ہو جاتے ہیں۔

"بقیۂ نقیہ" دیوان کی غزلوں میں یہی بات ہے۔

خسروؔ کے شعری نظریے کو ــــ بلکہ ان کے خیالات و حالات کی تبدیلی تک کو سمجھنے میں ان کے یہ دونوں دیباچے نہایت اہم ہیں۔

انھوں نے "بقیہ نقیہ" کا دیباچہ تمام کیا ہے ایک دعا پر ــــ دعا مانگی ہے کہ خدایا میرے سینے کی تختی سے جھوٹ کا نقش مٹا دے۔ میں نے جھوٹ کو کمال کے درجے تک پہنچا دیا، اب جھوٹ کی پوٹ لکھنے والے شاعر کو راستی یا سچائی کا راستہ دکھا دے۔

۹۹۔ خسروؔ کے پیش رَو نظامی نے فردوسی کی لائن سے ہٹ کر، واقعات داستان میں کہیں مناسب جگہ نکال کر ساقی سے خطاب کر کے چند اشعار بڑھا دیے ہیں۔

نظامی کی زندگی ایسی تھی کہ وہاں ساقی، مطرب یا مغنّی کا گزر نہ تھا۔ امیر خسرو کے یہاں یہ روز کے جلوے تھے۔ انھوں نے شاہی مطرب اور ساقی سے بھی کام لیا اور غزلیں بھی بڑھا دیں جو اسی دَور کے دیوان میں شامل ہو کر غزلیات کے مجموعوں میں جگہ پا گئیں۔

مثنوی میں جداگانہ غزل بڑھانے کا چلن امیر خسرو سے لے کر غالبؔ تک آیا۔ غالب نے قصیدوں میں جداگانہ غزلوں کا اضافہ کیا اور میر انیس کے بعد مرثیہ نگاروں نے، مرثیوں میں ساقی نامے کا۔

گویا امیرؔ کی تیکنیکی جدّت چھ صدی تک چلتی رہی۔

۱۰۰ ۔ ترجمہ : سکندر کا جام زندگی حضرت خضر نے تو خالی ہی چھوڑا تھا مگر نظامی گنجوی نے اس کے حلق میں (اپنے سکندر نامے کی بدولت) آب حیات اتار دیا۔ شاہانِ کیانی (ایران) کا تاج خاک میں مل گیا، باقی رہی تو فردوسی کی نظم شاہنامہ۔

اردو ترجمہ: مولانا حسن عباس فطرت
(پٹنہ)

۱۔ مطلع الانوار

کوہ کہ سنگ است وسخن کم کند
گر تو سلامش کنی او ہم کند
آنکہ نگوید بسلامت جواب
سنگ بہ از وی بطریق صواب

جوابِ سلام میں بخل کرنے والا پتھر سے بھی گیا گذرا ہے، کہ کم سخن پہاڑ بھی سلام کا جواب دیتے ہیں۔
(مختلف تلمیحات کو اس میں سمیٹا گیا ہے)

○

خلق دعا گو زپے فائدہ است
جائے لِیلاف پس از مائدہ است

دنیا، فائدہ پانے کے بعد ہی دعا گو ہوتی ہے پہلے نہیں۔ جب دسترخوان چن دیا جاتا ہے تبھی سورۂ لِایلاف کے پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے۔

○

نیست ہمہ نسل کریماں عزیز
تخم خیار ست بسے تلخ نیز

بڑوں کی سبھی اولاد بڑی نہیں ہوتی۔ اکثر ککڑی کا بیج تلخ بھی نکل جاتا ہے۔

خواجہ مبادا کہ بہ پیرانہ سر
بندۂ فرزند شود بہر خور
دہ پسر از یک پدر آسودہ گشت
یک پدر از دہ پسر افتد بدشت

خدا نہ کرے کہ کوئی بڑھاپے میں اپنی اولاد کا محتاج ہوجائے کیونکہ دس بیٹے تو ایک باپ کی بدولت خوش وخرم رہتے ہیں مگر ایک باپ، دس بیٹوں کے ہوتے ہوئے کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہ جاتا ہے

○

شرب و زنا تیرہ کند رائے را
شاہد و مے سست کند پائے را

میخواری و بدکاری، عقل کو سیاہ کردیتے ہیں اور شراب وعورت، ہمت وحوصلہ کو پست۔

○

ہر یک از انجم کہ بچشمت کم است
در محل خویش یکے عالم است
آں کہ بہ تمہارا نگری ذرہ وار
ہست بمقدار زمیں ہژدہ بار

جو تارا تمہیں ننھا منا سا دکھائی دیتا ہے وہ حقیقت میں ایک دنیا ہے شہا ستارہ کو ذرہ جیسا سمجھنے والو! سنو کہ وہ زمین سے اٹھارہ گنا بڑا ہے۔

○

تشنگیٔ لب رود از آبجوئے
تشنگیِ چشم برد آبروی

تشنہ لبی (پیاس) تو دریا و نہر سے چلی جاتی ہے (بجھ جاتی ہے)، مگر تشنگیٔ چشم (بدنظری) سے عزت چلی جاتی ہے۔

○

قطرۂ آبے کہ تنِ مردم است
در دلِ آں قطرہ جہانے گم است

اس قطرہ کے دل میں، جس سے پیکر آدم بنا ہے، ایک عالم پنہاں ہے۔

○

علم کہ نور است سیاہش مکن
شمع سیہ خانۂ جاہش مکن
خامہ مزن سوختن عامہ را
آتشِ تزویر مکن خامہ را

علم کو جاہ و مال کے اندھیرے گھر کی شمع بناکر اسے سیاہ نہ کردو کہ تمہارا علم ہی تمہاری روشنی ہے۔ لوگوں کو جلانے کے لئے قلم کو عیاری کا فتیلہ نہ بناؤ۔

○

گر بخرد گنج نہاں دادہ اند
لیک کلیدش بزباں دادہ اند

اگرچہ انسانی عقل کو ایسا خزانہ بخشا گیا ہے جو بند ہے مگر تمہاری زبان کو اس کی کنجی بنا کر بھی تو دیا ہے۔

ہر کہ بہ سہلے زجہاں شاد گشت
ہم چو من از بندگی آزاد گشت

جو تھوڑے میں خوش ہوجائے وہ میری طرح ہر غلامی سے آزاد ہے۔

○

باکہ و مہ صحبت از آناں گزیں
کز تو خردمند شود ہم نشیں

ہر چھوٹے بڑے کی صحبت میں اس طرح سے رہو کہ تمہارا ہم نشین تم سے دانائی حاصل کرے۔

وائی کہ تا چند چو افسردگاں
سجدہ کنی بر در ایں مردگاں
ای کہ گزاری بجنازہ نماز
بجدہ ندانی کہ ندارد جواز

ہائے افسوس تھکے ہارے لوگوں کی طرح کب تک ان مُردوں (امیروں) کے در پر سجدہ کروگے؟ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ جنازے کی نماز میں سجدہ ناجائز ہے؟

○

وحش و طیوری کہ چرا خوار کرد
سربگہ خورد نگوں سار کرد
قطرۂ آبے نخورد ماکیاں
تا نکند روی بسوئے آسماں

چرند و پرند، چرتے چگتے وقت ایک طرح کی خواری دکھاتے ہیں اور سر کو نیچے کئے رہتے ہیں مگر مرغیاں، پانی کا ایک قطرہ بھی گلے نہیں اتار سکتیں جب تک کہ سر کو آسماں کی طرف بلند نہ کریں۔

○

ساخت زیک قطرہ چو مردم گہر
طرفہ کہ نہ بحر بیک قطرہ دَر

ایک قطرہ سے انسان ایسا گوہر بنایا عجب یہ کہ ایک قطرے میں نو سمندر بھر دیے۔

○

بے خبر چہ آگہ کہ دریں سینہ چیست
کور چہ داند کہ در آئینہ چیست
لعل بکاں در نظرت چوں کشم
بینی اش آں روز کہ بیروں کشم

بے خبر کیا جانے کہ اس سینے میں کیا ہے؟ اندھے کو کیا خبر کہ آئینے میں کیا ہے۔
لعل جب تک کان میں رہتا ہے تم اسے کہاں دیکھ سکتے ہو ہاں جب میں اسے باہر نکال لاتا ہوں تب تم

اسے دیکھ پاتے ہو۔

من کہ خراشے زِخساں می کَشم
نیز پئے خود، بہر کساں می کَشم
انچہ مرا می خَلد اندر ضمیر
نیست در آنم زگزارش گُزیر
ہیچ کسے رہ سوئے بالا نیافت
تاقدم از ہمت والا نیافت

میں جو نااہلوں کے دئے ہوئے چرکے برداشت کرتا رہتا ہوں وہ اپنی خاطر نہیں بلکہ لوگوں کے لئے۔ جو میرے دل میں خلش ہوتی ہے اسے بیان کئے بغیر میرے لئے کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ جس نے ہمت سے قدم آگے نہ بڑھایا، اس نے بلندی کا راستہ نہیں پایا۔

○

چنبرِ نہ چرخ بسے بیخت خاک
تاتو بروں آمدی ای دُرِّ پاک
جان وجہانِ ہمہ عالم توئے
وانکہ نگنجد بجہاں ہم توئے
گنجِ خدا را تو کلید آمدی
نز پئے بازیچہ پدید آمدی
زندہ بجز آدمیاں نیست کس
کادمی از ناطقہ زندہ است وبس

تیری تلاش میں فلک مدتوں خاک چھانتا رہا تب کہیں اے گوہر پاک (انسان) تو ہاتھ آیا۔ جو کائنات میں بطور جان سما جائے وہ تو ہے اور جسکی سمائی کیلئے سارے جہاں ناکافی ہوجائیں وہ بھی تو ہی ہے۔ تو خدا کے خزانوں کی کنجی بن کر آیا ہے۔ تو کوئی کھلونا نہیں کہ اس سے سوائے کھیلنے کے اور کچھ کام نہیں لیا جاسکتا۔ آدمی کے سوا سبھی مردہ ہیں۔ انسان صرف وہ ہے جو اپنے نطق کی بدولت زندہ ہے۔

○

اے کہ زبُت طعنہ بہ ہندو بَری
ہم زوَی آموز پرستش گری

ہندوؤں کو بت پرستی پر مطعون کرنے والے! پرستش کا سبق بھی اس سے سیکھ۔

○

غازی رسمی کہ بغاوت رَوَد
ہست چو حاجی کہ تجارت رَوَد

لوٹ مار کے ارادہ سے نکلنے والا غازی ایسا حاجی ہے جو تجارت کی نیت سے کعبے کو جائے۔

○

سگ چو شُد آسودہ نشیند ز جوش
مردم آسودہ شود فتنہ کوش
در ہمہ جا سنگ محک از زر است
زر محکِ مردمِ بد گوہر است

آسودہ کتا چپ بیٹھ جاتا ہے مگر آسودہ آدمی فتنہ پرور ہو جاتا ہے۔ سونے کی کسوٹی پتھر ہے اور بد اصل کی کسوٹی سونا۔

○

چشم ز ابرو ست پسے زیر دست
ناظر ما در تہِ حاجب نشست
پُر ہنر از بے ہنراں لقمہ خواست
تیشہ و زیر ست تبر پادشاست

یالادستی کا معیار نرالا ہے۔ آنکھ، ابرو کے زیر سایہ دیدے، پلکوں کے دربانوں کے عقب میں، صاحب کمال بے ہنر کا محتاج تیشہ (آلۂ صناعی) وزیر اور کلھاڑا (ہلاکت کا ہتھیار) پادشاہ۔

۲ - شیریں و خسرو

چناں بر عیب خویشم دیدہ کن باز
کہ از عیبِ کساں بر نارم آواز

(خدایا!) مجھ پر اپنا عیب اس قدر وا شگاف کردے کہ لوگوں کی عیب جوئی کیلئے منہ نہ کھول سکوں۔

فرہاد، شیریں کو اپنی زندگی سنا رہا ہے

مُرَد نامَرد بر گنج از پئے قوت
کَنَد مرد از میانِ سنگ یاقوت
بکوہی قانعم با اندکی مُزد
نہ کارم با عَسَس، نہ بیم از دُزد
چو مَرداں دستکاری پیشہ کردم
چو بازاں دستمزد خویشتن خوردم

نامَرد روزی کے لیے خزانوں پر جان چھڑکتا ہے اور مرد پتھروں سے یاقوت نکالا کرتا ہے۔
ایک پہاڑی پر الگ تھلگ، تھوڑی سی اُجرت پر قانع ہوں کہ نہ پولیس کا جھگڑا نہ چور کا ڈر۔
میں نے مَردوں کی طرح دستکاری کو اپنا لیا ہے اور شاہین کی طرح اپنے ہاتھ سے حاصل کی ہوئی روزی پر گذر اوقات ہے۔

○

بنال ای بلبل مہجور ماندہ
بیاد دوستان دور ماندہ

اے بلبل! بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد میں فریاد کر۔

○

دو چیز افزوں کند در عشق آتش
شرابِ جاں نواز و نغمۂ خوش

آتشِ عشق کو تیز کرنے والی چیزیں دو ہیں: شراب اور نغمہ۔

○

دلت بر گربہ ای گر مہربانست
نشانِ صحبتِ ایماں ہمانست
دلت را گر بہ بُرد، وگر نیز دست
برو پیشِ سنگ اندازش کہ مُردست

اگر تمہارا دل ایک بلی (یعنی معمولی سی جان) پر مہربان ہے تو یہ ایمان کی نشانی ہے۔ لیکن اگر تمہارا دل ایک بلی بھی نہیں لے جاسکتی تو سمجھ لو کہ وہ مُردہ ہوچکا ہے، اسے پتھر

○

بشادی غم مخور چندیں بیکبار
ز بہر روزِ غم چیزی نگہ دار

خوشی کے موقع پر ہی سارے رنج و محن نہ اٹھاؤ کچھ ایامِ غم کے واسطے بھی بچائے رکھو۔

○

ز حاجت بیش در دنیا مجو چیز
وگر نا جُستہ یابی رَد مکن نیز
چو گرد د اَبر دولت بر تو دُربار
فروتن باش ہم چو شاخ پُربار

ضرورت سے زیادہ کی تلاش مت کرو، لیکن اگر کچھ بے جستجو ہی مل جائے تو رَد بھی نہ کرو۔ اور دولت کا بادل اگر تم پر موتی برسانے لگے تو ثمردار شاخ کی طرح جھک جاؤ۔

○

چو بنشینی بروئے دوستاں شاد
فرامُش گشتگاں راہم کنی یاد

جب دوستوں میں ہنسی خوشی کے ساتھ بیٹھو تو بھولے بسروں کو بھی یاد کر لیا کرو۔

بُود سوزن بہ از تیغِ بُرندہ کہ ایں دو زندہ باشد، آں دُرندہ	کاٹنے والی تلوار سے سوئی کہیں بہتر ہے کہ وہ پھاڑنے والی ہے اور یہ سینے والی۔
○	
دریں گنبد، بہ نیکی بَرکش آواز کہ گنبد ہرچہ گوئی گویدت باز	اس گنبد (آسمان) کے نیچے نیکی کی آواز نکالو ورنہ یہ ہے گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے۔
○	
اگر خواہی کہ چندیں زندہ مانی مخور باہیچ دشمن، دوستگانی	اگر کچھ اور جینا چاہتے ہو تو کسی دشمن کے ساتھ شراب نوشی نہ کرنا۔

۴۔ مجنوں و لیلیٰ

باچنداں شغل خاطر آشوب چندیں بَرِنو دہم زریک چوب انصاف من ار تو ندہی اے دوست خود نافہ کند حکایت پوست در تو نکنیم ز آفریں شاد من خود کنم آفریں خود یاد زانکس کہ نگہ کند بہ تمکیں انصاف طلب کنم نہ تحسیں	اتنی مصروفیت و پریشانی کے باوجود میں ایک شاخِ قلم سے کیسے کیسے نئے نئے پھل پیدا کرتا ہوں۔ کوئی اس کی داد نہ دے، کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ نافہ کی خوشبو خود ہی اپنی شہرت کیلئے کافی ہے۔ تم کیا واہ واکیا کرو گے؟ میں خود اپنے آپ کو آفریں کہتا ہوں۔ جو شخص سوجھ بوجھ کی نظروں سے دیکھتا ہے اس سے میں داد و تحسین نہیں طلب کرتا صرف انصاف کا خواہشمند ہوں۔
○	
از شیوہ خود رمیدہ گشتم تسلیم ہماں جریدہ گشتم	میں اپنی راہ (غزل گوئی) سے بے راہ چلا، اور خود کو اس طرزِ شاعری (مثنوی) کے سپرد کر دیا۔ یا تنہا روانہ ہو گیا۔
○	
در شعبدہ مرد خنجر آشام	جو شخص خنجر کو گلے سے اتارنے کا تماشا دکھاتا ہے وہ

از پہلوئے خویش می خورد شام
ناداشت کہ نیست باخرد خویش
بازو پئے شکم کند ریش

اپنا پہلو کاٹ کر اسکی رقم سے، شام کی روٹی حاصل کرتا ہے مفلس جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتا وہ روزی کی خاطر اپنا بازو زخمی کر ڈالتا ہے حالانکہ روزی زور بازو سے حاصل کی جاتی ہے

○

کاہش جاں شد بگہ یاوری
زن بدرشتی و زباں آوری
مرد بیک عربدہ دل ریش کرد
زن بیکے عربدہ دہ بیش کرد

عورت بجائے ہمدرد ثابت ہونے کے، اپنی بدزبانی اور کڑوے پن سے زندگی تلخ کر دیتی ہے مرد ایک ہی مصیبت کے ہاتھوں پریشان ہو تو عورت ایک کی دس مصیبتیں بنا ڈالتی ہے۔

○

گرچہ عطا درہمہ جا دلکش است
ہرچہ بہنجار بود آں خوش است
دیدہ کہ از سرمہ دلیلش دہند
سرمہ نہ از چمچہ بمیلش دہند

جود و سخا ہر رنگ دل پسند ہے مگر بہتر وہ ہے جو محل و موقع کی مناسبت سے ہو (مناسب برتاؤ کے ساتھ ہو) کیونکہ اگر سرمہ آنکھ میں سلائی کے بدلے چمچے سے ڈالا جائے تو غلط ہوگا۔

○

پیر کہ خوبانش نپرسند باز
دل چہ کند، گر ننہد بر نماز

جسے حسینوں نے نظر انداز کر دیا ہو وہ پیر اگر نماز سے دل نہ لگائے تو اور کرے کیا؟

○

بندہ ہم آخر گہر آدم است
گرچہ کہ در سلک غلامی خم است
کار باندازہ بازوش دہ
بار بمقدار ترازوش نہ

غلام سہی، مگر ہے تو وہ بھی آدم بچہ۔ اس کی استطاعت کے مطابق کام دو۔ ترازو پر اتنا ہی بار کرو جتنا وہ اٹھا سکے۔

○

بیرون اجل چو نیست کارے
تا نیست اجل، بجوش بارے

مرنے کے بعد تو پڑے رہنا ہے ہی، موت سے پہلے جو ہو سکے کر چلو۔

نعمت بحضور سہل چیزست
ہرگہ کہ زدست شد عزیزست

قدر نعمت بعد زوال۔ جب نعمت ہاتھ سے نکل جائے تب عزیز ہوتی ہے۔

○

چوں ساقی پیش، صاف را بُرد
عیبم نکند کسے بدیں دُرد

جب اگلا ساقی شرابِ صاف پہلے ہی ختم کر چکا ہے تو پھر مجھے کوئی الزام نہ دے کہ صرف تلچھٹ دی ہے۔

○

حرفے کہ ازو دِلے کشاید
از ہر قلمے بروں نیاید

تحریر دل پذیر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

○

از یخ بتر است سینۂ سرد
کز گریۂ کس نباشدش درد

کسی کی آہ و زاری جس سینۂ سرد کو پگھلا نہ سکے وہ برف سے بدتر ہے۔

آں سوختہ پیر دوزخ آشام
خوش گفت کہ "سوختہ بہ از خام"

اس، نارِ جہنم کو حلق میں اتار لینے والے پیر سوختہ نے کیا خوب کہا ہے کہ "کچے سے جلا ہوا بہتر"

○

مُردہ است کہ بے خروش باشد
نشتر خورد و خموش باشد

زخم کھا کے چپکا بیٹھ رہنے والا مُردہ ہے

○

غم گرچہ بگفت دردناکست
در سینہ گرہ زدن ہلاکست

بیانِ غم دردناک سہی، مگر ضبط غم ؟ ہلاکت ہے۔

○

خس کہ کُند پرسشِ گرمت مگیر
کآتش خاشاک بود زود میر

گھاس پھوس (دیپاں) کی آنچ کی پروا نہ کرو کہ وہ دم کے دم میں جل بجھنے والی ہے۔

○

خس چو پراگندہ بصحنِ سرا
رُفتہ بجاروب شود، نز عصا

گھر کی صفائی جھاڑو سے ہوتی ہے، لاٹھی سے نہیں۔

۴۔ آئینہ سکندری

پشیماں زگفتار دیدم بسے
پشیماں نگشت از خموشی کسے
صدف زاں سبب گشت گوہر فروش
کہ از پائے تا سر ہمہ گشت گوش

زبان کھولنے سے تو میں نے بہتوں کو پشیمان دیکھا۔ لیکن خاموش رہنے کے سبب کوئی نہیں پچھتایا۔ سیپ کے دہن میں موتی تب آیا جبکہ وہ سراپا گوش (کان) بن گیا (جب سنو گے، سیکھو گے تبھی علم و ہنر کی کان بنو گے)

○

چو طاؤس شو پیکر آرائے خویش
ولیکن فرامش مکن پائے خویش

خوبیوں پر پھولنے کے ساتھ ساتھ ذرا اپنی کمزوریوں کا بھی دھیان رہے۔ مور اپنے پنجے نہ بھولے۔

○

ستانندہ ہر جائے بینی بسے
رسانندہ دشوار یابی کسے

لینے والے بہت، اور دینے والے؟ بہت ہی کم۔

○

چو نگزاشت اومی بشیشہ دروں
من از شیشہ شویم چہ آید بروں
سخن گوئی دیرینہ جادوئی بیش
کہ جادو گری کرد ز اندازہ بیش

میرے پیشرو (نظامی) نے چھوڑا کیا؟ فقط خالی بوتل۔ میں اسے دھو کے کیا پاؤں گا؟ اس شاعر کا کلام سحر و جادو تھا اور وہ بھی بے اندازہ و تصور۔

چو دہقاں کند خرمن از دانہ پاک
بود عاقبت قوت موراں بخاک

کسان جب کھلیان اٹھا لیتا ہے تو گرا پڑا دانہ، چیونٹیوں کو مل جاتا ہے (میری اور نظامی کی مثال یہی ہو سکتی ہے)

○

○

ازیں غم کہ باتوشہ ماندن بلاست
ہمہ عمر بے توشہ بودن خطاست

"مالدار ہونا جنجال پیدا کرتا ہے" یہ سوچ کر
کنگال بنا رہنا بہت بڑی بھول ہے۔

○

کسے رنج در حاصلے چوں برد
کہ از رنج او دیگرے بر خورد
یکے خورد در خواب نان وکباب
یکے را نیاید خود از فاقہ خواب

کیا کوئی شخص اس لئے محنت کرے گا کہ اس کی
جانفشانی کا پھل دوسرے لوگ کھا جائیں؟
حالت یہ ہے کہ ایک تو خواب میں مرغ مسلّم اڑائے
اور محنت کش بیچارے کی فاقے سے نیند اڑ جائے۔

○

چوں بیش وکمی نیست در مغز و پوست
ز نفرینِ بدخواہ و تحسینِ دوست
ندانم چرا مردم سنگ دل
ازیں شاد گردند و زاں تنگدل

جب یہ طے ہے کہ چھلکے اور گری دونوں میں، دشمن کی
بدزبانی اور دوست کی تعریف وتوصیف سے کمی بیشی نہیں
ہونے والی، تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سنگدل افراد
تعریف سے خوش اور برائی سے ناخوش کیوں ہوتے ہیں۔

○

دلم چوں بہ گوہر کشی خاص گشت
بدریائے اندیشہ غوّاص گشت
بہر غوطہ چنداں بروں ریخت دُر
کہ دریا تہی گشت و آفاق پُر

میرے دل میں جب یہ بات بیٹھ گئی کہ موتی نکالنے ہیں تو
غور وفکر کے دریا میں غوطے لگانا شروع کیا اور ہر غوطے میں
میں اتنے موتی نکال کر باہر لایا کہ آخر دریا خالی ہوا،
اور دنیا موتیوں سے بھر گئی۔

○

چو بر مست مہماں شوی روزہ دار
ترا دردِ سر گیرد او را خمار
بہ پرہیز چوں در خرامی بباغ
تو حسرت خوری، میوہ گنجشک وزاغ

اگر تم روزہ رکھ کر کسی میخوار کے مہمان بنو گے تو
دونوں کے لئے پریشانی دھری ہے۔ ایسے میں باغ
کی سیر کو نہ جانا بہتر ہے کہ تو (روزہ دار) فقط حسرت
وکوفت پائیگا اور میوے چڑیاں اور کوے کھائیں گے۔

○

بر آں نامہ کز یار گوید سخن
فسونِ حیات است و تعویذ تن

نامۂ محبوب (جیسا بھی ہو) زندگی کے لئے منتر اور
تن کے لئے تعویذ ہے۔

○

بمعشوق یک شب چہ باشیم شاد
کہ مہمانِ غیرے شود بامداد

ایک رات کے معشوق سے مل کر کیا خوشی ہو کہ
اسی طرح کل وہ کسی اور کا پہلو گرم کرے گا۔

○

من و ملکِ تجرید و گنجِ ہنر
فلک زیرِ پا، بوریا زیرِ سر

"ملکِ تنہائی ہے، اپنا خزانۂ ہنر اور میں، آسمان زیر
قدم ہے اور سر کے نیچے چٹائی۔

○

تن از شاہداں گشتہ کوتاہ دست
نشاطِ نظر ہم چناں بت پرست

اگرچہ اب میرے جسم کو حسینوں سے نہ رغبت ہے نہ وہ
ان کے قابل۔ مگر نظر کی حسن پرستی پہلے ہی جیسی ہے۔

○

گرامی کنِ گوہرِ آدمی
گرامی تریں جوہرِ آدمی

آدمی کا قیمتی سرمایہ اور آبرو بڑھانے والی شئے
"کلام" ہے۔

○

زبردست چوں سر بر آرد بجنگ
سر زیرِ دستاں در آید بسنگ
چو آشوب شمشیر گیراں بود
فرو ماندہ را خانہ ویراں بود

طاقتور غنیم جنگ کرنے اٹھتا ہے تو کمزوروں کو
تہس نہس کر دیتا ہے۔
جب جنگ کے بادل چھا جاتے ہیں تو (اکثر) غریب
کے گھر پر آفت آتی ہے۔

○

بشہر ایں مثل شہرۂ عالم است
کہ ہر کس ہنر بیش، روزی کم است

دنیا میں یہ مثل زبان زد ہے کہ جس کے پاس ہنر
زیادہ ہے اس کی روزی تنگ ہے۔

○

ہمہ روز عمرم بخفتن گزشت
ہمہ شب درافسانہ گفتن گزشت

میری ساری عمر یوں بسر ہوئی کہ رات کو داستان گوئی کرتا اور دن بھر پڑا سوتا رہا۔

○

طرازِ ہنر قصہ خام را
نبشتن بمشک است دشنام را

لاطائل موضوع کو فن کی خراد پر چڑھانا، مشک سے گالی لکھنے جیسا ہے (مشک فقط کلام خدا و تعویذ لکھنے کے لئے ہوتا ہے)

○

چو آزادہ را خوش بود روزگار
بہ آزادیش گردد آموزگار

جب کسی آزاد و بے ذمہ شخص کے اچھے دن آتے ہیں تو وہی دن اُسے بے لگام بھی کر دیتے ہیں۔

○

نگہ کن کہ تا مادر مہر سنج
براں طفل خود چند بُردست رنج

سوچو کہ محبت کی ماری ماں نے اس بچے کے لئے کیا کچھ دکھ نہ جھیلا ہوگا۔

کہ جلاد خونیں بشمشیر تیز
برآرد بیک لحظہ زو رستخیز

جسے خونی جلاد ایک وار میں ختم کر دیتا ہے۔

کجا دید قصاب رنج شبان
تبر زن چہ داند غم باغبان

قصاب اس گڈریے کا دکھ کیا جانے (جس نے بکرے کو پالا پوسا ہے) اور لکڑہارا باغبان کے دل کی حالت کیا سمجھے۔

چو بر خود نداری روا نشترے
مکش تیغ بر گردنِ دیگرے

جب تم اپنے جسم پر ایک نشتر نہیں جھیل سکتے تو دوسرے کی گردن پر تلوار چلانے کا حق تمہیں نہیں ہے۔

مگو مَرد صد کُشتم اندر نبرد
یکے زندہ کن تات خوانیم مرد

یہ کیا کہ جنگ میں سینکڑوں کے قتل پر فخر کر رہے ہو ہم تو تمہیں تب مرد جانیں جب کسی کو زندہ کر کے دکھاؤ۔

بدنبال آہو چہ پوئی چو ببر
اگر شیر مردی پی شیر گیر

ہرن کا تعاقب کیا کرتے ہو؟ بہادر ہو تو شیر سے پنجہ کشی کرو۔

۵۔ ہشت بہشت

حمد

اے کشایندۂ خزانۂ جود
نقش پیوند کارگاہ وجود
بودنی را ہمیشہ بود از تو
بود، نابود را وجود، از تو

اے خزانۂ جود کے کھولنے والے
کارگاہ وجود کی رونق و آن
ہونے والی، ہمیشہ تجھی سے ہوئی
وجود و عدم، سب تیرے دم سے ہے

باشہاں ہرچہ برخلافِ ہواست
نتواں گفت گرچہ باشد راست
ہرکہ شد راست گوئی داورِ خویش
زد بہ تیغِ زبانِ خود، سرِ خویش

بادشاہوں کے خلافِ مزاج، سچی بات بھی نہ کہنا چاہیئے، اور ہاں جس نے راستگوئی کو شعار بنایا، اس نے گویا اپنی ہی زبان کی تلوار سے اپنا سر کاٹ لیا۔

○

نغز گفت آں حکیم دانش مند
کو، ہنر ہرچہ بیش، دشمن بیش

ایک دور اندیش حکیم نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس کے پاس جتنا زیادہ ہنر (فن) ہوگا اس کے دشمن بھی اسی قدر ہوں گے۔

○

بیٹی کی تعریف و نصیحت

اے رُخِ تو چشم و چراغ دلم
خوب ترین میوہ ز باغ دلم
گرچہ کہ اخوان چو تو نیک اختر اند
نے ز تو در دیدۂ و دل بہتر اند
گاہ تماشا بدل باغباں
سرو ہماں باشد و سوسن ہماں

تیرا چہرہ میرے دل کا چشم و چراغ۔ اور تو میرے باغ دل کا خوب ترین میوہ ہے۔ گو کہ تیرے بھائی سب کے سب خوش بخت ہیں مگر میرے دل و نگاہ میں تجھ سے بہتر نہیں۔ باغباں کے دل میں سرو اور سوسن دونوں یکساں مقام رکھتے ہیں۔

دختر اگر نیست پسر کے شود — دختر اگر ناپید ہو جائے تو پسر کہاں سے آئیں
بے صدفِ تازہ گہر کے شود — صدف تازہ کے بغیر گوہر کب ہو سکتا ہے
بخت کہ فال تو ہمایوں نہاد — تیرے نصیب نے تیری فال نیک رکھی ہے
نام تو مستورۂ میموں نہاد — کہ تیرا نام مستورۂ میمون پڑا۔

(مستورہ یعنی مخفی۔ کنایہ پردہ نشینی سے ہے اور میمونہ اس بیٹی کا نام ہے اور میمون بمعنی خوش نصیب)

نہ سپہر

اہل ہند کی توحید پرستی

نیست ہنوز ارچہ کہ دیندار چو ما ہست بسے جائے باقرار چو ما	اگرچہ وہ ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔
معترفِ وحدت و ہستی و قدم قدرتِ ایجاد ہمہ بعد عدم	وہ خدا کو واحد، واجب الوجود اور ازلی و ابدی مانتے ہیں نیز یہ بھی کہ وہ عدم سے ہر شئے کو وجود میں لانے پر قادر ہے۔
رازقِ ہر بہ ہنر و بے ہنری عمر بر و جاں دہ ہر جا نوری	وہ ہر ایک ہنر مند و بے ہنر کا رازق ہے اور ہر جاندار کو جان دینے اور اس کی جان لینے والا ہے۔
خالقِ افعال بہ نیکی و بدی حکمت و حکمش ازلی و ابدی	وہ نیک و بد افعال کا خالق ہے اور اس کی حکمت و حکم ازلی و ابدی۔
فاعلِ مختار و مجازی بہ عمل عالمِ ہر کلی و جزوی ز ازل	وہ عمل میں مختار کل ہے اور ہر ایک کل اور جزو کا علم اسے ہمیشہ ہمیش سے ہے۔

عیسویاں روح و وَلد بستہ برو
ہندو ازیں جنس نہ پیوستہ برو

نصرانیوں نے اس پر روح و فرزند کا اضافہ کیا مگر ہندوؤں نے ایسا بالکل نہیں کیا۔

اخترِیاں ہفت خدا کردہ یقیں
ہندوئی توحید سرا منکر ازیں

ستارہ پرست ، سات خداؤں کو مانتے ہیں مگر توحید کے ماننے والے اہل ہند اس کے منکر ہیں۔

عنصریاں چار خدا بردہ گماں
گفتہ یکی ہندو ثابت بہماں

عنصری فرقے کا گمان ہے کہ خدا چار ہیں مگر ہندو نے اسے ایک ہی مانا ہے، وہ توحید پر ثابت قدم ہیں۔

خلق دِگر نور و ظُلم خواندہ بدل
ہندو از ینہا ہمہ پیوند گسل

دوسرے کچھ لوگ (زرتشتی) ثنویت کے قائل ہیں اور نور و ظلمت کو عالم پر حکمراں مانتے ہیں مگر ہندواں سب سے بَری ہیں۔

وانچہ کہ معبودِ برہمن بفرق
معترف است اوکہ نہ مثلی است زحق

اب رہی یہ بات کہ برہمن کس کس کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ تو خود ان کا کہنا ہے کہ "حق" کا کوئی شریک ہے نہ مثل اور نہ عقیدے کو اس سے کچھ سروکار،

معتقد انند بتقلید در اں
کانچہ رسیدہ است بما از پدراں

یہ صرف تقلیدی عمل ہے۔ یعنی جو کچھ ہم نے باپ، دادا سے پایا، آنکھ بند کر کے اسی کی تقلید کرتے رہے۔

نہ سپہر

وصف ہنگام سحر

صبحدماں کآئینۂ آفتاب
برد ز ہر دیدہ خیالات خواب

صبح کیا ہوئی گویا آئینۂ آفتاب نے ہر آنکھ سے نیند کا خیال ہی اڑا لیا۔

موج فشاں گشت بہ نزدیک و دور
چشمۂ خورشید ز دریائے نور

چشمۂ خورشید، نور کے دریا سے، نزدیک و دور ہر جگہ لہریں لینے لگا۔

غوطہ زد انجم چو شناور بر رود
کشتی مہ رفت بدریا فرود

ستاروں نے غوطہ خوروں جیسی ڈبکی لگائی اور چاند کی کشتی بھی دریا میں اتر گئی۔

شعلہ ز دلسوزیٔ مشعل نشست
شمع ز جانسوزیٔ پروانہ رست

مشعل کی ہمدردی میں شعلہ بیٹھ گیا اور شمع کو پروانے کی جانسوزی سے نجات مل گئی۔

نغمۂ مرغاں فلک آوازہ شد
نغمہ شنو را دل و جاں تازہ شد

مرغانِ چمن کے چہچہے فلک تک جا پہونچے، جس نے بھی سنا اس کی روح شاد ہوگئی۔

بادہ پرستاں بہ گلستاں شدند
رُود زنان بر سرِ دستاں شدند

بادہ پرستوں نے گلستاں آباد کیا اور سازندوں نے نغمہ چھیڑا۔

از طرفے بانگِ دعا شد بگوش
وز جہتے بانگ بر آمد کہ نوش

ایک جانب سے مناجات و دعا کی آواز کان سے ٹکرائی اور دوسری طرف سے صدا آئی کہ آؤ پیو۔

طُرفہ زمانیست دمِ صبحگاہ
ہم وَرَعَش خوش بود و ہم گناہ

صبح کا ترکا بھی کیا عجیب و غریب وقت ہے کہ اس میں عبادت کا لطف بھی بہت اور گناہ میں لذت بھی بیش از بیش۔

بس کہ بد و نیک دراں دم خوش است
زہد خوش و خوردنِ مے ہم خوش است

یہی ایک ایسا وقت ہے جب نیکی و بدی دونوں دل کو بھاتی ہیں۔ پرہیز گاری بھی اور بادہ خواری بھی۔

گرچہ کہ صوفی بصفا شد عزیز
ہست صفائے بہ مے لعل نیز

اگر صوفی، اپنے صفائے باطن کے باعث عزیز ہے تو بادۂ سرخ سے بھی صفائے قلب ہوتا ہے۔

صبح و شراب و لبِ ساقی و جام
صفوت ازیں بیش کجا و کدام

صبح ہو اور صبوحی، لب ہو اور ساقی و جام، اس سے زیادہ تازگی و نفاست بھلا کہاں اور کون سی ہوگی۔

○

نہ سپہر

وصف ہند در علوم و فنون

چوں بہمہ اقلیم کہ جنبد قلمی
نیست بہ از دانش و حکمت رقمی

جہاں جہاں قلم کی حکمرانی ہے وہاں یہ مانی ہوئی
بات ہے کہ دانش و حکمت سے بہتر کوئی شے نہیں۔

اول ازیں پایہ سخن تازہ کنم
پس بگردِشے دردگر اندازہ کنم

تو پھر پہلے میں حکمت و دانش سے بات کا آغاز
کرتا ہوں اس کے بعد دیگر اشیا کی باری آئے گی۔

گرچہ بہ حکمت سخن از روم شدہ
فلسفہ زانجا ہمہ معلوم شدہ

اگرچہ روم و یونان کا نام حکمت میں مشہور ہوا اور
ان کا فلسفہ سارے عالم میں پھیل گیا۔

لیک نہ ہند است ازاں مایہ تہی
ہست درو یک یک از اندیشہ بہی

مگر اہل ہند کا دامن اس سے خالی نہ تھا۔
ہندستان میں ایک سے ایک بہتر دانشور ہوئے ہیں۔

منطق و تنجیم و کلامست درو
ہرچہ کہ جز فقہ تمامست درو

منطق، نجوم، علم کلام، غرض کہ فقہ کے سوا سبھی
علوم، ہند میں موجود ہیں۔

علم دِگر ہرچہ ز معقول سخن
بیشتری ہست. برآئین کہن

معقولات کے علوم بھی زیادہ تر طرز قدیم پر رائج ہیں۔

برہمنی ہست کہ در علم و خرد
دفتر قانونِ ارسطو بدَرد

ایسے ایسے پنڈت یہاں پائے جاتے ہیں کہ علم و دانش کے میدان میں یونانی فلسفی ارسطو کا دفتر چاک کردیں۔

وانچہ طبیعی و ریاضیست ہمہ
ہیئت مستقبل و ماضیست ہمہ

طبیعیات، علم ریاضی، قدیم وجدید ہیئت، سب یہاں موجود ہے۔

رومی ازاں گونہ کہ افگندہ بروں
برہمناں راہست ازاں مایہ فزوں

رومیوں (یونانیوں) نے جتنا علم باہر نکالا ہے اس سے کہیں زیادہ برہمنوں کے پاس محفوظ ہے۔

من قدری برسر ایں کار شدم
در دلِ شاں محرم اسرار شدم

میں نے بھی کسی قدر اس معاملے میں تلاش سے کام لیا تو ان (براہمہ ہند) کے دلوں میں اتر گیا اور اندر کی باتیں معلوم ہوئیں۔

باغ کی توصیف

بفردوسِ حرم بافیست دل کش کہ فردوسِ ارم بنود چناں خوش	محل سرا کی جنّت میں ایسا دل کش باغ لگا ہوا ہے کہ باغِ ارم اس کے سامنے ہیچ ہے۔
بکشور ہر کجا نادر نہالی درو نوشیدہ از کوثر زلالی	سارے ملک میں، جہاں کہیں کوئی کمیاب پودا نظر آیا، یہاں لایا گیا اور کوثر کے خالص پانی سے سینچا گیا۔
ز گلہائے خراساں گونہ گونہ نمودہ ہر یکے دیگر نمونہ	خراسانی پھولوں میں بھی طرح طرح کے پھول کے نمونے یہاں موجود ہیں۔
دمیدہ برگ نازک یاسمیں را لباسِ پرنیاں دادہ زمیں را	چنبلی کی نازک کونپلوں نے زمین کو ریشمی لباس پہنا رکھا ہے۔
برآب نسترن، نسریں شکرخند چو دو ہمشیرۂ نزدیک مانند	سیوتی کی چمک دمک دیکھ کر موتیا کھلی جا رہی ہے جیسے پاس پاس دو بہنیں کھڑی ہوں۔

گلِ کوزہ کہ دورِ چرخ گرداں
پدید از خاک پاک ہند کرد آں

گلِ کوزہ وہ پھول ہے کہ آسمان نے چکر کاٹ کر ہندستان کی خاک پاک کو اس کی پیداوار کے لیے چنا ہے۔

گل صد برگ را خوبی زحد بیش
نمودہ صد ورق دیباچۂ خویش

تلے اوپر سینکڑوں پتیوں کے پھول کی خوبی حد سے سوا ہے، سینکڑوں ورق میں اس کا دیباچہ سمایا ہے۔

گل مارا بہندی نام زشت است
وگرنہ ہر گلے باغِ بہشت است

ہندی پھولوں کا نام ہی ہے جو ہندستانی زبان میں ہے اور بھونڈا سا لگتا ہے ورنہ یہاں کا ہر پھول باغ بہشت کا نمونہ ہے۔

○

خضر خانی
(عشیقہ)

ہندستانیوں کے رنگ و حسن پر

اگرچہ بیشتر ہندوستاں زاد
بہ سبزی مینیرند چوں سرو آزاد

اگرچہ اصل نسل کے ہندستانیوں میں، اکثر کا رنگ سروآزاد کی مانند سیاہی مائل سبز (سانولا) ہوتا ہے۔

ولی بسیار باشد سبزۂ تر
بلطف از لالہ و نسریں نکوتر

مگر بہت سے ایسے ہیں جن کی سبزی میں سیاہی نہیں، لالہ و نسرین سے زائد تازگی ہوتی ہے۔

بسی زیبا کنیز سبز فام است
کہ صد چوں سروِ آزادش غلام است

بہت سی سبز فام کنیزیں ایسی ہیں جن کی زیبائی ورعنائی کے آگے سروآزاد جیسے سیکڑوں پانی بھریں۔

نہ چوں طاؤس بے دنباں زشت اند
کہ در خوبی چو طاؤس بہشت اند

وہ خوش جمالی میں بہشت کے مور جیسی ہیں لیکن بے دُم کے مور کی طرح بدنما نہیں ہیں۔

سہ گونہ رنگ ہندوستاں زمیں است
سیاہ و سبز و گندم گوں ہمیں است

سرزمین ہند میں حُسن کے تین رنگ ہیں، سیاہ، سبز اور گندمی۔

بگندم گونست میلِ آدمی زاد
کہ ایں فتنہ ز آدم یافت بنیاد

گندمی رنگت پر آدمی کا لپکنا فطری بات ہے
کیونکہ فتنہ گندم کے بانی میاں باوا آدم ہیں۔

یکی گندم یکام اندر نمک دہ
ز صد قرصِ سپید بے نمک بہ

ایک نمکیں گیہوں، منھ میں جاکر سیکڑوں پھیکی د
سیٹھی ٹکیوں سے بہتر ہوتا ہے۔

سیہ را خود بدیدہ جائگاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است

سیاہ رنگ وہ ہے کہ آنکھ میں اسے جگہ ملی
۔ آنکھ کے اندر پتلی بھی سیاہ ہے۔

ز بہر دیدہ باید سرمہ را سود
سپیدہ، عارضی، رنگی است بیہود

آنکھ کے لئے سرمہ کی ضرورت ہے جو سیاہ
ہوتا ہے اور سفید رنگ عارضی و بے فائدہ
ہے۔

ازیں ہر دو نکوتر رنگ سبز است
کہ زیب اختراں زاورنگِ سبز است

ان دونوں سے بہتر سبز (سانولا) رنگ ہے
کیونکہ جس تخت سے تاروں کی زینت ہے (آسمان)
وہ بھی سبز ہے۔

برنگِ سبز رحمت ہا سرشت است
کہ رنگِ سبز پوشانِ بہشت است

سبز رنگ میں رحمتیں گوندھ دی گئی ہیں۔ دیکھ
لو کہ جنتی لوگوں کا لباس سبز ہوتا ہے۔

وصفِ مطربانِ ہند

شد زنِ مطرب بہ نوا پروری
آمدہ بر زہرہ و مشتری

جب گانے والی نے راگ چھیڑا تو ماہ و مشتری بھی سننے کے لئے آموجود ہوئے۔ (یعنی محفل خوبرویوں سے پُر ہوگئی)

غمزہ زنانے ہمہ مردم فریب
سیبِ زنخ، خالِ زنخ، تخمِ سیب

یہ سب غمزہ و ادا دکھانے والیاں، مردم فریب ہیں۔ ان کے زنخ (ٹھوڑی) سیب ہیں اور خال (تل) سیب کا بیج۔

چاہِ زنخ روشن و صافی چو ماہ
روی نماگشتہ چو آبے بہ چاہ

ان کا چاہِ زنخ، مثل چاند کے روشن و مصفّیٰ ہے۔ جس طرح کنویں کے پانی میں صورت اتر آتی ہے یوں ہی وہ بھی رونما ہیں۔

پردہ برانداختہ از آفتاب
کردہ بیک غمزہ جہانے خراب

گویا کہ آفتاب سے پردہ ہٹ گیا ہے (ان کا چہرہ ایسا منور ہے) اور غمزہ و ادا سے انھوں نے ایک دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔

روی چو خورشید برافروختہ
جانِ کساں زآتش خود سوختہ

سورج کی طرح ان کا چہرہ جگمگ کرتا ہے اور لوگوں کی جان و دل کو اپنی آگ میں جلاتا رہتا ہے۔

از رخ شاں آمدہ مقنع فرود
رفتہ بچہ ماہِ مقنع فرود

جب انھوں نے رُخ سے نقاب سرکایا تو دیکھو نخشب مقنع کا چاند کنویں میں خجالت سے چھپ گیا۔

زابروی خم گشتہ کماں ساختہ
تیرِ مژہ نیم کش انداختہ

خم ابرو کو پُشت کماں بنا کے مژہ کا تیر نیم کش چھوڑ دیا ہے۔

ناوکِ شاں چوں شدہ بیروں زکیش
دیدہ سپر کردہ سیاہی خویش

جب انھوں نے ترکش سے تیر رہا کیا تو آنکھ نے اپنی سیاہی کو سپر بنا لیا (اور گھائل ہو گئی)

از کفِ خود آئینہ بنہادہ پیش
دیدہ رخِ خود بکف دست خویش

ان کی ہتھیلیاں کیا ہیں؟ گویا اپنے سامنے خود انھوں نے آئینہ رکھ لیا ہے اور اپنے ہی ہاتھ کی ہتھیلیوں میں اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔

موی میاں و سرشاں فرق جوی
شکل ہلال آمدہ بے فرق موی

پتلی کمر اور چوٹی کے بال میں فرق کرنا دشوار ہے ہو بہو خمدار چاند کا سا نصف دائرہ بنتا ہے۔

جعد بہ پیچیدہ بپا در خرام
ماہی ساق آمدہ در پائے دام

چلتی ہیں تو سر کی چٹیا پیروں میں الجھتی ہے، پنڈلی کی مچھلی جال میں پھنستی نظر آتی ہے۔

قامت شاں سرو دمی راستیں
پُر زگل ساعدِ شاں آستیں

جب تن کے سیدھی کھڑی ہوتی ہیں تو سرو کا سا قد نکلتا ہے اور ان کی آستین میں گوری کلائیوں کے پھول بھرے ہیں۔

سینہ بسے خستہ و دل کردہ ریش
ہر نفس از تیزی آواز خویش

ہر بار جب وہ اونچی لے میں سانس تھامتی ہیں تو سننے والوں کے سینے زیر و زبر ہو جاتے ہیں، دل تڑپ اٹھتے ہیں

مصافِ اوّل غازی مَلِک بالشکرِ دہلی

(غازی ملک غیاث الدین تغلق کا حسن خاں براد و سے پہلا معرکہ)

(مفہوم اُردو)

سپاہے تشنہ وبے آب وُپر گرد
دراں گرد از خویٔ خویش آبخور کرد
رسید اندر مقام حرب گہ تیز
زآبِ تیزِ شمشیر آتش انگیز
رَواں گشتند ہر سو کارواراں
کہ آرایند صف ہائے سواراں
نفیرِ چاؤشاں بَرشد تعیُّوق
عَلم بارا بہ گردوں رفت منجوق
صفِ پیلاں چو صَف ابرآزار
ہر ابرے، برق، حملہ، بادرفتار
بہ پُشتِ پیل ترکاں تیر درِ شست
چو کوہے کو، بہ پشت کوہ بنشست
پسِ پیلاں سواراں صف کشیدہ
بجوشش از پشیت ماہی تف کشیدہ

رات کے سفر اور گرد و غبار سے سپاہیوں کے حلق خشک ہو گئے تھے اور اسی غبار آلود حالت میں اپنے پسینے کی بوندیں پی رہے تھے۔ سواروں نے صفیں جمائیں، چاؤشوں نے جنگ کی قرنا پھونکی۔ ہاتھیوں کی صف برسات کی کالی گھٹا کی طرح بڑھی۔ جس میں کا ہر ہاتھی حملہ کرنے میں بجلی اور چلنے میں آندھی تھا۔ ان پہاڑ جیسے ہاتھیوں پر تیر انداز چٹکی میں تیر دبائے تیار بیٹھے تھے۔
ہاتھیوں کے عقب میں سواروں کی صفیں موج در موج چلی آرہی تھیں۔ قلب لشکر میں فرزند خسرو خاں کا سپہ سالار "خانخاناں"، سر پر چتر لگائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے "کلاہ باراں" کے نیچے بھیگی گھاس ہوتی ہے۔

میانِ قلب، فرتند چتر بر سر
تہ چتر تمارُوغ خوردۂ تر
ہمہ خان و ملوک اندر چپ و راست
بسنجتی درنشتہ از پئے خاست
سیلیح و ساز ہر یک خسروانہ
ز آہن گشتۂ دریا روانہ
زبانِ کوس گردوں رہ نہادہ
و لے زاں زہ بلا و فتنہ زادہ
گرفتہ نیزہ برکف پہلواناں
دعا بر مال و جانِ رفتہ خواناں
جہانِ لشکر آتش وار سرکش
ہمی جنبید چو طوفانِ آتش

دائیں بائیں سردارانِ لشکر اشارے کے منتظر تھے۔ ہر ایک شاہانہ اسلحے سے سجا اور لوہے میں غرق تھا۔ نقارہ کی آواز سے آسمان ہلا جاتا تھا۔ پہلوانوں کے ہاتھ میں نیزے دبے ہوئے تھے۔ اور ہر فریق اپنی اپنی خیمہ کا جویاں و دعاگو تھا۔

غرض یہ لشکر شعلوں کی طرح سر اٹھائے آگ کے طوفان کی طرح بڑھ رہا تھا۔

سخن در سن و عمر و خواندن شہزادگان

(علاؤالدین خلجی کی جملہ کمسن اولاد کا تعارف جن کو حسن خاں نے مروا ڈالا)

(مفہوم اردو)

چناں است ایں حکایت راستا راست
کہ چوں بر قطب دیں رفت آنچہ حق خواست
زبعد آں سریر آرائے مرحوم
برادر پنج دیگر ماند مظلوم

شاہ قطب الدین مبارک بن علاؤالدین خلجی کی خسرو خاں کے ہاتھوں ہلاکت کے بعد اس کے اور پانچ بھائی ظلم کا شکار ہوئے۔

یکے خان فرید اسم بلند اصل
کہ بود اصلش زدہ شہ وصل بروصل
کہ آں سنگے سزائے ملک سنجے
بہ پنجش عمر در دھرے سپنجے
تمامش دادہ قرآن ختم منشور
دلش زاں نور گشتہ سورۂ نور

ان میں سے ایک کا نام فرید خاں تھا، دس پشت سے جس کی نسل میں بادشاہت چلی آرہی تھی، وہ فن سپہ گری سیکھ رہا تھا اور عمر سے پنج یعنی ۱۵ سال تھی، قران ختم کرچکا تھا۔

دگر بو بکر خاں دیباچہ تخت
سزائے ملک اگر یاری کند بخت

دوسرا ابو بکر خاں، اگر قسمت یاوری کرتی تو سزاوار بادشاہت تھا۔

زسالِ عمرِ او دو ہفتہ رفتہ
دو ہفتش سال و او ماہ دو ہفتہ
ہنوز در نظم و نثر لفظ و خط خوش
طبیعت خود چہ گویم آب و آتش

چودہ سال کا چنکدا آفتاب، چندے ماہتاب۔ نظم و نثر کا رسیا، خوش نویس ابھی اس کی عمر کے نئے سال کا دوسرا ہفتہ تھا کہ قضا آگئی، اس کے مزاج میں پانی کی نرمی اور آگ کی گرمی بھری تھی۔

علی خانِ گرامی ہشت سالہ
جبینے چوں گل و روئے چو لالہ
ز قرآں تا بقد افلح رسیدہ
قدش افلح شدہ کاں صفحہ دیدہ

ان سے چھوٹا ایک آٹھ سالہ علی خاں گلاب پھول جیسا، جو قرآن کے اٹھارویں سیپارہ تک پہونچا تھا۔

بہا خاں ہم بہشتم سال نوخیز
ثلث دوم قرآں ورق بیز

اور دوسرا اسی کا ہم سن نوخیز فرزند جو بیسواں سیپارہ پڑھ رہا تھا۔

ز پنجم سال عثماں بہرہ ور بود
ہنوز از جمع قرآں بے خبر بود

شہزادہ عثمان پانچ سال کا ننھا منا معصوم بچہ تھا جس نے ابھی تک قرآن پڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔

قطعات

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنجِ سخن
علمِ موسیقی ز فنِ نظم نیکوتر بود

خسرو سے ایک گویا کہہ رہا تھا کہ اے شاعری کے مخزن! علم موسیقی فن شاعری سے بہتر ہے۔

زاں کہ ایں علمے ست کز دقت نیاید در قلم
واں نہ دشوار ست کاندر کاغذ و دفتر بود

کیونکہ یہ (موسیقی) ایسا علم ہے جو اپنی باریکی یا نزاکت کے سبب قلم کی گرفت میں نہیں آتا حالانکہ شاعری کاغذ و دفتر میں سما جاتی ہے۔

پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم
ہر دو را سنجیدہ بر وزنے کہ آں بہتر بود

میں نے جواباً کہا کہ یوں تو میں دونوں فن میں کامل ہوں اور دونوں کو میں نے ایسے باٹ سے تولا ہے جو بہتر و مناسب تھا۔

فرق می گویم میانِ ہر دو معقول و درست
تا بہ انصاف آں کز ہر دو دانش ور بود

مگر میں دونوں کے مابین ایک معقول و درست فرق بتاتا ہوں تاکہ دونوں فن کا جانکار صحیح فیصلہ کر سکے۔

نظم را علمے تصور کن بہ نفسِ خود تمام
کو نہ محتاجِ سماع و صوتِ خنیاگر بود

شاعری کو ایسا علم جانو جو بذات خود گانے والے کی آواز یا سننے والوں کا محتاج نہیں۔

گر کسے بے زیر و بم نظمے فرو خواند رواست
نے بمعنی ہیچ نقصان، نے بلفظ اندر بود

اگر کوئی ترنم یا آواز کے اتار چڑھاؤ بغیر بھی کسی نظم کو پڑھے تو نہ معنی میں کچھ خلل پڑے گا نہ لفظ میں کہیں فرق آئے گا اور نظم درست رہے گی۔

ور کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں در سرود
چوں سخن نبود ہمہ بے معنی و ابتر بود

لیکن گویا گاتے وقت چاہے جتنا "ہوں ہوں، ہاں ہاں" کی الاپ اٹھائے جب تک لفظ کو شامل نہ کریگا سب کچھ بے معنی اور الٹا سیدھا رہے گا۔

نائے زن رابیں کہ صوتے دارد و گفتار نے
لاجرم محتاج در قول کسے دیگر بود

بانسری والے کو دیکھو کہ آواز ہے مگر لفظ نہیں اسلئے وہ بلاشبہ گانے اور گفتار کے لئے کسی دوسرے کے کلام کا محتاج ہوگا۔

نظم را حاصل عروسے داں و نغمہ زیورش
نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

لہٰذا شاعری کو دلھن سمجھو اور نغمہ کو اس کا زیور۔ اگر اچھی دلھن بے زیور بھی ہو تو اس کے حسن میں کچھ عیب نہیں رہتا۔

○

مشو خسروؔ بہ شعر خویش غرّہ
کہ گویندہ بسے ہست از پس و پیش

خسروؔ اپنی شاعری پر مغرور مت ہو کہ تیرے آگے پیچھے بہت سے کہنے والے پڑے ہوئے ہیں۔

چو گفت خویش را بے عیب خواہی
بچشم دشمناں بیں گفتہ خویش

اگر تو اپنے کہے ہوئے کو بے عیب دیکھنا چاہتا ہے تو اپنے کلام کو دشمنوں کی نظر سے دیکھا کر۔

ہمہ کس گفتِ خود را خوب داند
دگر یار ست ہم تحسیں کند بیش

ہر شخص اپنے کلام کو عمدہ ہی سمجھتا ہے۔ دوست احباب وہ تو ہمیشہ تعریف میں مبالغہ کرتے ہیں۔

○

از گفتن مدح دل بمیرد
شعر ارچه تر و فصیح باشد
گر دد ز نفس چراغ مردہ
گر خود نفسِ مسیح باشد

کسی کی مدح (قصیدہ گوئی) کرنے سے دل مرجاتا
ہے بھلے ہی شعر عمدہ اور فصیح کیوں نہ ہو۔
چاہے مسیحا ہی دم (سانس) پھونکے، لیکن چراغ
پھونک مارنے سے بجھ جاتا ہے۔

روشن دلانِ صاف درون را خلل بود
در کار خلق چشم کشادن بہ خیر و شر
پوشیدہ نیست نزد ہمہ کس کہ طاس را
سوراخ عیب باشد و غربال را ہنر

صاف باطن و روشن ضمیر اشخاص کے لئے یہ عیب
کی بات ہے کہ وہ اوروں کے کاروبار معاملات یا
پیشے کو برا یا بھلا خیال کریں۔ سبھی جانتے ہیں کہ
طشت میں سوراخ ہونا عیب کی بات ہے مگر
چھلنی کے لئے خوبی کی۔

قصیدہ بحر الابرار

کوسِ شہ خالی و بانگِ غلغلش دردِ سر است
ہر کہ قانع شُد بخشک و تر، شہِ بحر و بر است

دنیاوی بادشاہوں کا نقارہ کھوکھلا، اور اس کی آواز بارِ خاطر ہے۔ جو روکھی سوکھی پر قانع رہے وہی بحر و بر کا بادشاہ ہے۔

تا ز بربادی نہ جُنبی پا بدامن کش چو کوہ
کادمی مشتے غبار و عمر، بادِ صرصر است

اپنی جگہ پر دامن میں پاؤں کھینچ کر پہاڑ بن جاؤ، تاکہ ہوا کا کوئی بھی جھونکا تمہیں ہلا نہ سکے۔ کیونکہ عمر رواں مثل آندھی کے ہے اور آدمی بس ایک مٹھی خاک۔

مَردِ بینا دَر گلیم و بادشاہِ عالم است
تیغِ خفتہ در نیام و پاسبانِ کشور است

صاحبِ نظر انسان، گدڑی میں لپٹا سہی۔ مگر ہے دنیا کا بادشاہ۔ تلوار میان میں سوئی ہوئی سہی، مگر کرتی ہے ملک کی پاسبانی۔

نَفسِ خاکِ تُست ہر گہ نور بر تو تافتست
سایہ زیرِ پا بوَد ہر گہ کہ بَر تارک خور است

جب تک تجھ پر نورانیت سایہ فگن رہے، نفس تیرا غلام ہے۔ جیسے کہ سورج سر پہ چمکے تو سایہ قدموں کے نیچے آجاتا ہے۔

در تصوف رسم جستن خندہ کردن بر خود است
در تیمم مسح کردن، خاک کردن بر سر است

تصوف میں شریعت کے آداب و رسوم کی تلاش، اپنا مضحکہ اڑاتا ہے جیسے کہ تیمم میں مسح کرنا، سر پر خاک ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔

دل ز سودا ہائے گوناگوں بشوی، جمع باش
زانکہ اوراقِ سپید، ایمن ز بیم ابتر است

دل کو مختلف کدورتوں اور خیالات سے پاک صاف کر کے خاطر جمعی سے بیٹھو کیونکہ اگر کاغذ سادہ ہو تو اس کے بکھر جانے (گم ہو جانے) کا خطرہ نہیں ہوتا۔

از جراحت زندہ گردد دل کہ فاسد شد چوں خوں
وردِ "الشافی ھو اللہ" بر زبانِ نشتر است

غم کا چرکا لگنے سے دل زندہ ہو جاتا ہے۔ جب خون بگڑ جائے تو نشتر کی زبان "اللہ شفا دینے والا ہے" کہہ کر اسے صاف کر دیتی ہے۔

کار اینجا کن کہ تشویش است در محشر بسے
آب ازیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

محشر میں کچھ نہ کر پاؤ گے وہاں تو عجب اتھل پتھل ہو گی۔ یہاں جو کرنا ہے کر لو یہیں سے پانی بھر کر لے چلو، دریا پر شور و شر بہت زیادہ ہے۔

احتراقِ مفلسی، مصباحِ راہِ ظلمت است
ذوالفقارِ حیدری، مفتاحِ بابِ خیبر است

سوزشِ افلاس، اندھیری رات کا چراغ ہے اسی طرح جیسے ذوالفقار حیدری دروازۂ خیبر کی کلید ہے۔

رسم مردم نیست خود بینی بہ بیں مردم بچشم
عینِ بینائی و در خود ننگرد زاں سرور است

جوانمردوں کا کام خود بینی نہیں۔ آنکھ کی پتلی کو دیکھ لو کہ وہ بذات خود بینائی ہے پھر بھی خود کو نہیں دیکھتی۔ اسی لئے اسے بلند مقام حاصل ہے۔

چشم حاصل کن کہ آنگہ می نماید بے حجاب
آنچہ پنہاں در پسِ ایں شیشۂ صافی در است

صاحب نظر ہو تبھی وہ حقیقتیں تم پر بے نقاب ہو جائیں گی جو اس کائنات کے پردے میں پوشیدہ ہیں۔

ہر کرا خاموش بینی پند می گوید بگیر
کالتِ دُشنام گفتن جاہلاں را منبر است

جسے خاموش پاؤ، اس سے نصیحت حاصل کرو (کہ حقیقی ناصح وہی ہے) کیونکہ منبر تو اب جاہلوں کے گالی بکنے کا آلہ بن چکا ہے۔

معنیٔ خسرو مؤثر ناید اندر مُردگاں
ہیچگہ دیدی کہ مستی در سبو و ساغر است

خسرو کی بات مُردوں پر اثر نہیں کرتی، اس میں تعجب کیا؟ مٹکی یا پیالے میں (جو بے جان اور اندر سے خالی ہیں) مستی نہیں ہوا کرتی۔

○

بقرآن السّعدینؒ

غزل ⑧

اے دہلی و اے بُتانِ سادہ پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ	واہ رے دہلی ، اور یہاں کے سادہ نازنین ۔ پگڑی باندھے ہیں مگر پیچ آڑے ترچھے رکھے ۔
خوں خوردن شاں باشکار است گرچہ پنہاں خورند بادہ	شراب تو چھپ کر وہ چوری چھپے پیتے ہیں مگر خون برملا دھڑلّے سے)
فرماں نبرند زانکہ ہستند از غایتِ ناز خود مُرادہ	ناز و انداز میں چونکہ وہ اپنی مراد آپ ہیں اس لئے سرکشی اتنی ہے کہ کسی کا حکم نہیں مانتے
ایشاں ہمہ بادِ حُسن در سر وینہا ہمہ سر بباد دادہ	ان سبھوں کے سر میں غرورِ حسن بھرا ہوا ہے اور ان کے چاہنے والوں نے سر کی بازی لگادی ہے
خورشید پرست شد مسلماں زیں ہندوگانِ شوخ و سادہ	ان شریر مگر سادہ ہندو زادوں کے کارن مسلمانوں نے اپنا دین بدل دیا ، اور سورج کو پوجنے لگے ۔

کردند مرا خراب و سرمست
ہندو بچگانِ پاک زادہ

اِن پاکیزہ فطرت ہندی محبوبوں نے مجھے خراب و سرمست کر ڈالا۔

بر بستۂ شاں بموئے مرغول
خسروؔ چو سگیست در قلادہ

ان کے گھونگھرالے بالوں میں خسرو یوں بندھ گیا ہے جیسے پٹے میں کتے کا گلا۔

غزل (۹)

خرم آں لحظہ کہ مشتاق بیاری برسد
آرزو مند نگاری بہ نگاری برسد

کیا کہنا اس وقت کا، جب عاشق اپنے معشوق تک پہنچ جائے، اور محبوب کا آرزو مند اُسے پالے۔

دیدہ بر روئے چو گل بند و نبود خبرش
گرچہ در دیدہ ز نوکِ مژہ خاری برسد

آنکھ اس کے پھول سے چہرے پر لگی ہو اور اگر آنکھ میں پلکوں کا کانٹا بھی چبھ جائے تو اسے خبر نہ ہونے پائے۔

ای خوشا تلخیٔ پاسخ کہ دہد بعد از ہجر
کہ خماری شکن از بہرِ خماری برسد

ہجر کے بعد جب وہ کڑوے کسیلے جواب سے تواضع کرے، اس تلخی کا بھی کیا لطف ہوتا ہے کہ عشق کا خمار توڑنے کی (یہ) دوا بھی مہیا ہو جاتی ہے۔

لذتِ وصل ندارد مگر آں سوختۂ
کہ پس از دوریٔ بسیار بیاری برسد

وصل میں کیا لذت ہوتی ہے؟ یہ تو وہی تم زدہ جانتا ہے جو بہت ہی لمبی دوری کے بعد اپنے یار سے ہمکنار ہو جائے۔

خسروا یار تو گرمی نرسد خود میگو
بہر تسکین دل خویش کہ آری برسد

خسرو! یار آئے نہ آئے، تم تو بس یہی ورد جاری رکھو کہ وہ آتا ہی ہوگا۔ اور اسی سے اپنے دل کو تسکین دے لیا کرو۔

غزل ⑩

شد ہوا سرد کنوں آتش و خرگاہ کجاست
بادۂ روشن و رخسارۂ دل خواہ کجاست

ہوا میں خنکی آگئی، آتش و خرگاہ کہاں ہے اور بادۂ روشن و چہرۂ محبوب و دل پسند رخسار کہاں ہے۔

وی ہمی رفت و زبس دیدہ کہ غلطیدہ بخاک
گفت یارب کہ کجا پائے نہم راہ کجاست

وہ جا رہا تھا اور تمام خلق کی نگاہیں اس کی راہ میں لوٹ رہی تھیں (بچھی ہوئی تھیں) اتنی زیادہ کہ وہ کہنے لگا، میں قدم کہاں رکھوں؟ راستہ تو ہے نہیں!

ماہ من کور شد ایں دیدہ ز بیداریٔ شب
آخر از زلف نپرسی کہ سحرگاہ کجاست

اے میرے چاند! (روز روز کی) شب بیداری سے میری آنکھوں کا نور چلا گیا تو کیوں زلف سے نہیں پوچھتا کہ آخر صبح کہاں ہے؟ (زلف کی سیاہی نے رات پھیلا رکھی ہے)

پیش ازیں کردمی از آہ دل خود خالی
دل گراماند کنوں طاقت آں آہ کجاست

پہلے کبھی کبھی میں آہیں بھر کر دل کو آہوں سے خالی کر لیا کرتا تھا اور اب نہ وہ دل ہے نہ آہ کی وہ طاقت۔

غزل

(۱)

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بہ چنیں روز ز دلدار جدا
ابر باراں و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا
سبزہ نوخیز و ہوا خرم و بُستاں سر سبز
لبل روئی سیہ ماندہ ز گلزار جدا
دیدہ از بہر تو خونبار شد اے مُردم چشم
مردمی کن، مشو از دیدۂ خونبار جدا
عمت دیدہ نہ خواہم کہ بماند پس ازیں
اند چوں دیدہ ازاں نعمت دیدار جدا
سن تو دیر نپاید چو ز خسرو رفتی
ل بسے دیر نہ ماند چو شد از خار جدا

ساون کی جھڑی لگی ہوئی ہے اور میں اپنے یار سے چھوٹ رہا ہوں۔ ایسے موسم میں دل کو محبوب سے کیونکر الگ کروں ؟

بادل برس رہا ہے، میں اور یار رخصت ہونے کو ہیں۔ میں بھی رو رہا ہوں، بادل بھی، یار بھی۔

باغ ہرا بھرا، ہوا خوشگوار، سبزہ ہمک رہا ہے۔ مگر آہ کہ بلبلِ بدبخت (مراد خود سے ہے) ایسے میں گلزار سے دور ہے۔

اے آنکھوں کے تارے! میری آنکھیں تیرے لئے خونبار ہو گئیں۔ اب بھی انسانیت دکھا اور لہو روتی آنکھوں کو جدا نہ ہو۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں لیکن جب انھیں (تیرے) دیدار کی نعمت میسر نہ ہو تو مجھے آنکھوں کی نعمت بھی درکار نہیں۔

تو خسرو کو چھوڑ کر چل دیا تو تیرا حسن بھی ٹھیرنے والا نہیں۔ کوئی پھول جب کانٹے کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو خود بھی دیر تک نہیں ٹھیرتا۔

غزل (۲)

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر وہائے وہوئے

تمام عمر کی بادشاہی اور اس کے تام جھام سے کہیں بہتر فراغت کی گھڑیوں میں کسی ماہ رو کا دیدار ہے۔

نفسم بہ آخر آمد، نظرم نہ دید سیرش
بجز ایں نماند مارا ہوسے و جستجوئے

وقت آخر آن پہنچا اور نگاہ اس کے جلوے سے محروم ہی رہی حالانکہ ساری عمر میری یہی ایک آرزو اور جستجو تھی۔

بخدا کہ رشکم آید بدو چشمِ روشنِ خود
کہ نظر دریغ باشد بچناں لطیف روئے

ایسے لطیف و نازک حسن کو تارِ نظر میں اسیر کرلیا؟ بخدا مجھے اپنی آنکھوں پر رشک آتا ہے۔

دلِ من کہ شد ندانم چہ شد آں غریب مارا
کہ گزشت عمر و نامد خبرش ز ہیچ سوئے

وہ دل جو کبھی میرا تھا اس غریب کو ہوا کیا؟ وہ ہے کہاں؟ آہ کہ میرا پیمانۂ عمر لبریز ہو چلا مگر اس گم گشتہ کی خبر کہیں سے نہ آئی۔

مکُن اے صبا مشوّش سرِ زلفِ آں پری وش
کہ ہزار جانِ خسرو بفدائے تارِ موئے

اے صبا تو اس پری وش کی زلفیں الجھانا نہیں کہ اس کے ایک ایک بال پر خسرو کی ہزار جانیں فدا و قربان۔

غزل ③

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتانِ آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن ازاں زیبا تری

تیرا سندر مکھڑا، بتان آذری کے رشک کا سبب ہے۔ میں جتنی بھی تعریف کروں تو حسنِ زیبائی میں میری تعریف سے آگے ہے۔

ہرگز نیاید در نظر نقشے ز رویت خوب تر
شمسے ندانم، نے قمر، حورے ندانم، نے پری

تیرے چہرہ سے اچھا کوئی نقش مجھے تو نہیں ملا۔ نہ آفتاب نہ ماہتاب، نہ حور نہ پری، کوئی بھی تیرے جیسا نہیں۔

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، امّا تو چیزے دیگری

میں سارا زمانہ گھوم چکا۔ ایک سے ایک دلربا کی چاہ کو برتا۔ بہت سے گلرخ دیکھے مگر تو ان سب سے الگ بلکہ انوکھا ٹھہرا۔

اے راحت و آرام جاں، با قدِ چوں سروِ رواں
زیں ساں مرو دامن کشاں کارام جانم می بری

سروِ رواں جیسا قامت لے کر اس طرح ہم سے دامن کشاں نہ جا کہ یوں تو میری راحت و آرام سبھی لئے جا رہا ہے۔

خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

تیرے شہر میں خسرو آپڑا ہے، یہ مسافر بھی ہے، سائل بھی "خدا کے واسطے" غریبوں پر بھی ایک نظرِ کرم ہو جائے!

غزل (۴)

نہفتہ می خورد آں شوخ و منکر است بر دیم
کجاست دولتِ آنم کہ تا دہانش ببویم

وہ شوخ چھپ کے پیتا ہے اور ہمارے سامنے اس سے انکار کرتا ہے؛ اب کیا کروں؟ اتنی حیثیت تو ہے نہیں کہ اس کا منہ سونگھ سکوں۔

شبیش دیدم در خواب، سالہاست کہ ہر شب
ز شام تا سحر آں خوابِ پیشِ خویش بگویم

بس ایک ہی رات اسے خواب میں دیکھا تھا۔ ایک مدت گذر گئی کہ شام سے صبح تک وہی خواب خود کو سنایا کرتا ہوں۔

مگر زِ وادیِ جاناں صبا برد خبرِ من
کہ کاروانِ سلامت گزر نہ کرد بسویم

اب تو یہی صورت رہ گئی ہے کہ وادیٔ جاناں سے صبا آئے اور میری خبر لے جائے۔ کیونکہ پرسش احوال کرنے والے کسی کارواں کا اِدھر گزر ہی نہیں ہوا

بہ ناتوانیم از وے چہ آں کہ حال بپرسیش
ہمیں بس است کہ من سر بر آستانۂ اویم

میں ناتواں و درماندہ، یہی بہت ہے کہ اس کے آستانے پر پڑا ہوں اتنی تاب کہاں کہ اٹھ کر حال پوچھ سکوں۔

کنوں کہ توبہ شکستم کدوئے مے بسرم نہ
چناں کہ کاسۂ سر بشکند ز بارِ سبویم

اب جب کہ میں نے توبہ توڑ ہی دی تو پھر شراب سے بھرا ہوا کدو (مٹکا) میرے سر پر رکھ دو اور یوں کہ اس کے بھاری بوجھ سے میرے سر کا پیالہ چکنا چور ہو جائے۔

غزل ⑤

بیا تا بے گل و صہبا نباشیم
کہ گل باشد بسے و ما نباشیم

پھول بہت کھلیں گے مگر ہم نہ ہوں گے۔ جس دم تک پھول اور شراب کی لذت نصیب ہے، آؤ، مل لیں۔ ورنہ ہم لذتوں سے محروم رہ جائیں گے۔

ز گل نازک تریم و چند گاہے
بجز زیرِ گل و خارا نباشیم

ہر چند کہ ہم نازکی میں گل سے بھی سوا ہیں مگر وہ وقت آنے والا ہے کہ کیچڑ، پتھر کے نیچے پڑے ہوں گے۔

بیا یارا و با ما باش امروز
چو می دانی کہ ما فردا نباشیم

اے دوست جب تجھے خبر ہے کہ کل ہم نہ ہوں گے تو پھر آج تو ہمارے ساتھ مل بیٹھ لے۔

چو تنہا بود می باید، ہماں بہ
کہ باہم صحبتاں تنہا نباشیم

ایک نہ ایک دن تنہائی ہمارے ساتھ رہ جائے گی تو بہت غنیمت ہے کہ ہم مذاقوں کے ہوتے، ہم تنہا نہ رہیں۔

چو زیرِ پائے می باید شدن خاک
چرا چوں خاکِ زیرِ پا نباشیم

آخرالامر جب سب کو پاؤں تلے کی خاک ہو جانا ہے تو کیوں نہ ہم پاؤں تلے کی خاک (خاکسار) بن کر رہیں؟

چو بودن نیست خسرو جز دو روزے
دو روزے نیز بگزر تا نباشیم

خسرو جب زندگانی دو روزہ ہی ٹھہری تو موت سے قبل کے ان دو دنوں کو بھی سلام (کہ دو روز کا کیا لینا دینا!)

غزل ⑥

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
تنم از بے دلی بیچارہ شد، بیچارہ تر بادا

عشق میں میرا دل آوارہ ہوگیا، بھلے ہی اور آوارہ ہوجائے۔ میرا تن بیماریٔ دل سے ناکارہ ہوگیا بھلے ہی اور ناکارہ ہوجائے۔

رخت تازہ است، بہر مردنِ خود تازہ تر خواہم
دلت خار است و بہر کشتنِ من خارہ تر بادا

تیرا رخِ شاداب، چاہتا ہوں کہ اور تازہ و شاداب ہو حتیٰ کہ میری موت کا سبب بن جائے۔ تیرا دل جو پتھر ہے خدا کرے مجھے مارنے کی غرض کو اور سخت ہوجائے۔

گرا ے زاہد دعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
کہ آں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

اے زاہد اگر تو مجھے دعائے خیر دینا ہی چاہتا ہے تو یہ دعا دے کہ اس آوارۂ کوئے بتاں کی آوارگی میں اور پر رنگ جائیں۔

ہمہ گویند کز خونخوارتیش خلقے بجاں آمد
من ایں گویم کہ بہر جان من خونخوارہ تر بادا

لوگوں کا کہنا ہے کہ اس (محبوب) کی خونخواری سے ایک خلقت جاں بلب ہے اور میں کہتا ہوں کہ میرے لئے اس کی خونخواری کچھ اور سوا ہوجائے۔

دلِ من پارہ گشت از غم نہ زانگونہ کہ بہ گردد
وگر جاناں بدیں شادست یارب پارہ تر بادا

میرا دل غم سے اس طرح پارہ پارہ ہوا کہ رفو کا امکان ہی ختم ہوگیا لیکن اگر محبوب کو یہی پسند ہے تو خدایا یہ دل اور ٹکڑے ہوجائے۔

چو با تر دامنی خو کردہ خسرو با دو چشم تر
بآبِ چشم پاکاں دامنش ہموارہ، تر بادا

دونوں آنکھیں اتنی بہیں کہ خسرو کا دامن تر رہنے لگا (تر دامنی سے ایک اشارہ گناہگاری کی جانب ہے) جب حال ہے تو کچھ یوں ہو کہ پاکیزہ لوگوں کے آنسو اسے تر کر دیں

غزل (۷)

زیں پس سرِ آں نیست کہ من زُہد فروشم
ساقی قدحے دِہ کہ بروئے تو بنوشم

زہد و تقویٰ کا بیوپار؟ ہیں ادھر جنجال؟ ساقی لا ایک جام دے کہ اسے تیرے روبرو چڑھا کر وہ پرانا قصہ تمام کروں

جائے کہ نیرزد بجوے، دینِ دُرستم
ایں توبہ صد جائے شکستہ چہ فروشم

جہاں میرا ثابت و سالم دین و ایمان جو کے ایک دانے سے بھی کم مایہ ہو وہاں میری ٹوٹی پھوٹی توبہ کی کیا قدر و قیمت ہوگی اس کا کیا صلہ مانگوں!

بس پیرِ خرابات کہ بُردم شفاعت
تا باز کشادند درِ میکدہ دوشم

کتنے پیرِ خرابات ایسے ہیں جن کی سفارش سے کل میں نے بند میخانے کھلوا لیے۔

اکنوں کہ سرم شد بہ درِ میکدہ پامال
چوں بیم دہد محتسب از مالشِ گوشم

محتسب، مجھے گوشمالی کی دھمکی دینے چلا ہے۔ وہ بھی اب جب کہ میرا سر پامالِ درِ میکدہ ہو چکا۔

پوشید(ہ) بسے خدمتِ بت کردم و زیں پس
زُنّار ہویں می کُنَدَم، از تو چہ پوشم

چھپ چھپ کر میں نے بت کی خدمت بہت کی، مگر اب وہ تقاضا کرتا ہے کہ چھپ کر نہیں۔ کھلے عام زنار گلے میں ڈالو۔ یہ راز آپ سے کیا چھپاؤں!

چوں باز نیامد ز بت و بتکدہ خسرو
اصلاحِ مزاجِ سگِ دیوانہ چہ کوشم

اگر خسرو بت و بتکدہ سے باز نہیں آتا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ سگِ دیوانہ کے علاج کی کوشش بے سود ہے۔

مُتَفَرِق اشعار

ئے گُلم نے بُلبلم نے شمع نے پروانہ ام
عاشقِ حسنِ خودم بر حسنِ خود دیوانہ ام

نہ میں گل نہ بلبل نہ شمع نہ پروانہ، اپنے حسن کا عاشق اور اسی کا دیوانہ ہوں۔ یعنی میرا وجود بھی وجودِ گل کے حسن کا حصہ ہے۔

قصۂ زلفش نمی گویم بہ کس
زاں کہ خاطر ہا پریشاں می شود

اس کے زلف کی حکایت میں کسی سے نہیں کرتا، خواہ مخواہ (زلف کی پریشانی) سن کر لوگ پریشان ہو گے۔

رسید از بتاں جان خسرو بہ کام
بہ یک زخم کُن کارِ او را تمام

بتوں نے خسرو کی مراد پوری کر دی بس ایک وار کی ضرورت ہے جو اسے ٹھنڈا کر دے گا۔

از من قرار و صبر ندانم کجا شدند
من خود ز خویش ہیچ ندانم کجا شدم

کیا خبر کہ میرا قرار و صبر کہاں چلا گیا؟ میں تو خود اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا ہوں۔

ہستی من رفت و خیالش نماند
ایں کہ تو بینی، نہ منم بلکہ اوست

میری ہستی نابود ہو گئی اس کا تصور بھی نہ رہا۔ یہ جو تم ایک ہیولیٰ دیکھ رہے ہو یہ میں نہیں بلکہ وہ محبوب ہے

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
یارب چہ روز بود کہ از ما جدا شدند

خبر نہیں میرے پرانے یار کہاں گئے۔ خدایا کون سا منحوس دن تھا جب وہ مجھ سے جدا ہوئے تھے۔

آں سروراں کہ تاجِ سرِ خلق بودہ اند
اکنوں نظارہ کُن کہ ہمہ خاک پا شدند

وہ لوگ جو مخلوق کے سر کا تاج بنے ہوئے تھے۔ آج دیکھو تو سب کے سب پیر کی دھول ہو گئے ہیں۔

گر نو بہار آید و پرسد ز دوستاں
گو اے صبا کہ آں ہمہ گلہا گیا شدند

اے صبا! اگر وہ نئی بہار آئے اور یاروں کا حال پوچھے تو کہہ دینا کہ وہ تمام پھول تازہ گھانس بن کر اگ رہے ہیں۔

اے گل چو آمدی زِ زمیں، گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

اے پھول! تو زمین کے اندر سے آرہا ہے نا، بتا کہ وہ چہرے کیسے ہیں جو گردِ فنا تلے دب گئے۔

خورشید بودہ اند کہ رفتند زیر خاک
آں ذرّہ ہا کہ ہر ہمہ اندر ہوا شدند

وہ ذرے جو ہوا میں منتشر ہیں کبھی سورج جیسے تھے، مٹی کے نیچے گئے اور یہ حشر ہوا۔

رُخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست و بے خبرم کایں سخن چہ بود

سب کو جلوہ دکھایا اور مجھ سے کہا تم نہ دیکھو۔ کہاں یہ ذوقِ خود نمائی اور کہاں یہ بات؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر میں اسی میں مست ہو گیا۔

تُرکِ ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکرِ مصری ندارم کز عرب گویم سخن

میں ترک ہندوستانی ہوں، ہندوی میں جواب دیتا ہوں میرے پاس مصری شکر نہیں کہ عربی میں گفتگو کر سکوں۔

دیں ز رسول آمدہ کامی زمرۂ دیں
حبِ وطن ہست ز ایماں بہ یقیں

رسولؐ نے فرمایا ہے کہ اے اہلِ دین حبِ وطن یقیناً جزوِ ایمان ہے۔

آمد بہارِ مشک دم، سنبل دمید و لالہ ہم
سبزہ بصحرا زد قدم سروِ روانِ من کجا؟

مہکتی بہار آ گئی، سنبل و لالہ نکل آئے، صحرا کے فرش پر سبزے نے قدم رکھ دیا۔ مگر میرا سروِ رواں کہاں ہے

خسروم من گلے از خونِ دلِ خود رستہ
بوئے من ہست جگر سوز، مبوئید مرا

میں خسرو ہوں، ایسا پھول جو اپنے خون کی نمی سے اُگا ہے۔ مجھے نہ سونگھنا، میری بُو جگر سوز ہے۔

عمر بگذشت و حدیثِ دردِ ما آخر نشد
شب بہ آخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

عمر تمام ہونے آئی مگر دکھ بھری کہانی کا انت نہ ہوا۔ رات اب جانے کو ہے۔ قصہ مختصر کرتا ہوں۔

کجا روم کہ زِ کوئے تو ہر کجا کہ روم
رسد ز جعدِ کمندت، خمِ کمند آنجا

کہاں جاؤں، تیرے کوچہ سے نکل کر جہاں بھی جاتا ہوں، تیرے جوڑے کا پھندا کمند بن کے وہیں آ پہنچتا ہے۔

با خیالِ زلف و رویت چشمِ من
نیمہ ابر است و نیمہ آفتاب

تیری زلف و رخ کے تصور میں میری آنکھ نصف ابر، و نصف آفتاب ہو کے رہ گئی ہے۔

جہاں پُر آشنا و من بغم غرق
کہ دریائے محبت را کراں نیست

جان پہچان کے لوگوں سے دنیا بھری ہے۔ میں پھر بھی غم میں ڈوبا ہوا ہوں کہ محبت کے دریا کا کوئی کنارہ نہیں۔

از دوزخ اگر نشاں بپرسند
من گوئیم خواب گاہِ تنہا است

اگر مجھ سے دوزخ کا نشان پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ تنہائی کی خواب گاہ کا نام دوزخ ہے۔

ہست صحرا چوں کفِ دست پُر از لالہ چو جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

صحرا ہتھیلی کی طرح پھیلا ہوا اور اس پر کے پھول پیالوں کے مثل دھرے ہیں کیا کہنے اس کفِ دست کے جو اتنے سارے جام سنبھالے ہو۔

بر تنِ شیریں نظر ہم ہست بار از نازکی
بر دلِ فرہاد، کوہِ بے ستوں ہم بار نیست

شیریں کا بدن اتنا نازک کہ نظر بھی اس پر گراں گذرتی ہے اور فرہاد کا دل، اتنا جفاکش کہ کوہِ بے ستون بھی اس پر بار نہیں۔

عاشق شدم و محرم ایں کار ندارم
فریاد کہ غم دارم و غم خوار ندارم

میں عاشق تو ہو گیا مگر ہمراز کوئی نہ ملا۔ فریاد ہے کہ غم تو ہے مگر غم خوار نہیں۔

دانی کہ ہستم در جہاں، من خسروِ شیریں زباں
گر نائی از بہر دلم بہر زبانِ من بیا

تمہیں تو خبر ہے کہ میں دنیا بھر میں شیریں زباں مشہور ہوں۔ میرے دل کا لحاظ کر کے نہیں آتے نہ سہی میری زبان (کی مٹھاس) کی خاطر چلے آؤ۔

سخن بشنو مگر از بندہ خسرو
جہاں چوں او سخن گوئی ندارد

سخن کی طلب ہے تو خسرو کو سنو۔ کہ آج دنیا میں اس جیسا سخن گو نہیں۔

شکر آں است کہ اندر لبِ تُست
سخن ایں است کہ ما می گوئیم

شکر وہ ہے جو تیرے لبوں میں ہے اور سخن وہ ہے جو میری زبان پر ہے۔

گلِ نو رسید و بوئے ز بہارِ من نیامد
چہ کنم نسیم گل را کہ ز یارِ من نیامد

تازہ پھول آ پہنچے مگر میری بہار کی مہک مجھ تک نہ پہنچی۔ ان پھولوں سے مہکی ہوئی نسیم کا کیا کروں؟ یہ میرے محبوب کی طرف سے تو آئی نہیں۔

از تنم جز پیرہن موجود نیست
جانِ من جاناں شد و تن پیرہن

تن، بدن میں سوائے لباس کے کچھ باقی نہیں۔ میری روح سر بسر "جاناں" ہو چکی ہے اور میرا تن اس کا لباس

آدمی خوش دل نہ باشد گرچہ در جنت بود
آدمی خود کے تواند بود، چوں آدم نبود

آدمی جنت پا کر بھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔ رہے بھی کیسے؟ جب آدم وہاں خوش نہ رہ سکے۔

غم مخور اے دل کہ باز ایام شادی ہم رسد
ہر کجا دردی است آں را عاقبت مرہم رسد

اے دل تو غم نہ کھا کہ خوشی کے دن پھر ضرور آئیں گے۔ کیونکہ جب درد ہوتا ہے تو بالآخر دوا بھی نکل آتی ہے۔

یار مہمانِ تست اے دیدہ!
مَردماں را بگو بروں باشند

اے آنکھو! یار تم میں آن بسا ہے۔ تمہارا مہمان ہوا ہے اب "مردم" کا کیا کام؟ کہو باہر نکلیں (مَردُم یعنی پتلی اور لوگ شاعر نے یہاں دونوں سے کام لیا ہے)

ہیچ کس نیست کہ او را بہ جہاں دردے نیست
وانکہ دردیش نباشد بہ جہاں ہیچ کس است

کوئی شخص دنیا میں دکھ، درد سے خالی نہیں اور اگر کوئی درد سے بالکل ہی کورا ہو تو وہ ہیچ پوچ ہے۔

رخ چہ پوشی چوں حدیث حسنِ تو پنہاں نماند
گل بصد پردہ دروں از بوئے خود مستور نیست

جبکہ ترے حسن کا چرچا گلی گلی ہے تو اس نقاب کا کیا فائدہ؟ پھول چاہے جتنی تہوں میں چھپا دیا جائے اس کی مہک اپنے آپ سے چھپ نہیں سکتی۔

کاروانِ دوستاں بسیار بگذشت و ہنوز
بیں کزیں رہ چند ازیں ساں کارواں خواہد گذشت

دوستوں کے کتنے ہی قافلے اس راہ حیات سے گذر گئے۔ دیکھتے رہو۔ ابھی اور کتنے کارواں ایسے گذر جائیں گے۔

رازِ خوں آلود خود اے دل مدہ با من بروں
کایں ورق خام است و حرفے زدی بروں خواہد گذشت

اے دل اپنا خون آلود راز مجھ سے نہ کہہ کہ میں کچے کاغذ جیسا ہوں جو حرف اس پر اترے گا، باہر پھوٹ جائیگا۔

با غمش خو کردم امشب گرچہ در زاری گذشت
یادمی کردم از آں شبہا کہ در یاری گذشت

گو ہجر کی رات گریہ وزاری میں کٹی مگر میں نے اس کے غم سے سمجھوتہ کر لیا اور بس ان راتوں کو یاد کرتا رہا جو یاری و دوستی میں گذری تھیں۔

عاشقاں گشتہ براہت خاک و من در غیرتم
کاں غبارِ غیر بر دامانِ تو خواہد نشست

تیرے نشانِ راہ پر عشاق مر مٹے اور خاک ہو گئے مگر میں مرا جا رہا ہوں کہ اب غیر کا غبار ترے دامن پر جگہ پایا کرے گا۔

نیست آں مردانگی کاندر غزا، کافر کشی
در صفِ عشاق خود را کشتن از مردانگی است

غزاوت (جہاد) میں کافر کو مار گرانا مردانگی نہیں۔ ہم عاشقوں کے فرقے میں مردانگی یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو مار گرائے۔

سیلیٔ باد ببیں کہ چساں افگند بخاک
غنچہ کہ می نہد دو سہ روزی کلاہ کج

زمانے کی مار؟ توبہ ہے! دو تین دن جو کلی نے کج کلہی دکھائی تو ہوا نے زور کا طمانچہ رسید کیا اور خاک پر دے مارا۔

بادہ بہ سفال آر کہ ما دُرد کشانیم
کس از پئے ما ساغر و پیمانہ نسازد

ہم تلچھٹ کے پینے والے، ہمیں مٹی کے پیالے میں ہی دیدو۔ ہماری خاطر بھلا کوئی کیوں ساغر و پیمانہ بنانے لگا!

گفتم "چگونہ می کُشی و زندہ میکنی"؟
از یک جواب کُشت و جوابِ دگر نہ داد

"جان سے مار کے جلاتے کیونکر ہو" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے ایک جواب میں مار ڈالا۔ اور پھر خاموشی اختیار کی (جوابِ دگر سے ہمیں زندہ نہ کیا)

بگذار تا بہ قحطِ وفا جاں دہم از انک
تخمِ وفا کہ کاشتہ بودیم بر نہ داد

وفا کا قحط پڑا ہے مجھے اسی میں مرجانے دو۔ کیونکہ میں نے جہاں جہاں وفا بوئی تھی وہ جل کر رہ گئی۔

گرت بتی و شرابی است وقت را خوش داں
کہ در جہاں بکسی عمر جاوداں نہ دہند

بہت اچھی کٹ رہی ہے اگر شراب و صنم کا ساتھ ہے۔ چار روزہ زندگی میں جتنا مزہ لے سکو لے لو کہ یہاں کسی کے لئے عمر جاوداں نہیں ہے (بس اسی کو عمر جاوداں سمجھو)

رخشِ زمانہ تند و تو خواہی قرارِ عمر
گر قوتیت ہست عنانِ زمانہ گیر

اگر تم میں طاقت ہے تو زمانے کی لگام سختی سے کھینچے رہو ذرا بھی ڈھیل نہ دینا، وقت کا گھوڑا منہ زور ہے قرار نہیں لینے دیتا۔

حدیثِ جنت و دوزخ دگر مگو خسرو
وصالِ یار طلب کن گذار ایں وسواس

خسرو جنت و دوزخ کی باتوں میں کیا دھرا ہے؟ اصل بات تو یار سے ملنا ہے، اس کی تدبیر کرو اور ان خرافات سے گذر جاؤ۔

زبانِ شوخِ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش باشد کہ می بودے زبانش در دہانِ من

میرے شوخ کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی سے نابلد۔
کیا اچھا ہوتا کہ زبانِ یار میرے دہن میں ہوتی۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

میں عشق کا مارا کافر۔ مجھے مسلمانی کی حاجت کیوں ہو؟
اور میری ہر رگ تار بن گئی ہے اس لئے مجھے زنار کی
بھی ضرورت نہیں۔

ای برہمن بارہ زود کردۂ اسلام را
یا چو من گمراہ را در پیش بت ہم بار نیست

اے برہمن مجھ جیسے برگشتۂ اسلام کو قبول کر، کہیں ایسا تو
نہیں کہ مجھ جیسے گمراہ کو بتوں کی محفل میں بھی جگہ نہیں ملتی؟

بشبِ نشاط یارا، چہ خبر ترا زِ خسرو
کہ بجانبِ تو روزے شبِ تارِ من نیامد

اے دوست تجھے اپنی شبِ نشاط میں خسرو کا حال
کیا معلوم! میری اندھیری رات تیری سمت کبھی آئی ہی نہیں

جاناں اگر شبیت دہن بر دہاں نہم
خود را بخواب سازو مگو کایں دہان کیست

اے میرے محبوب اگر کسی رات میں اپنا منہ تیرے منہ پر
رکھ دوں تو خود کو سوتا ہوا ہی بنائے رکھنا اور ٹوکنا نہیں
کہ یہ کس کا منھ ہے۔

ساقیا گر زاہداں مے خوارہ را کافر کنند
ما بہ محرابِ دو ابروے بت مسلمانش کنیم

اے ساقی اگر کوئی عبادت گزار کسی پینے والے کو کافر
کہتا ہے تو کہا کرے میں تیرے ابروؤں کی محراب تلے
اس کو مسلمان بنا لیتا ہوں۔

بادہ در اسلام اگر گوئی حرام، اینست کفر
کایں چنیں نعمت خوریم وانگاہ کفرانش کنیم

اگر تم کہو کہ شراب اسلام میں حرام ہے، تو یہ کتنا کفر ہے،
کیوں کہ آدمی ایسی نعمت چکھے اور پھر اس سے منکر بھی ہو۔
اسی کو کفرانِ نعمت کہتے ہیں۔

ایں منم یارب کہ با دلدار ہم زانو شدم
پہلوئے او رفتم اندر خواب و ہم پہلو شدم

اے خدا کیا آج میں ہی ہوں جو کہ اپنے دلدار کے زانو سے
زانو ملائے ہوئے اور بسترِ خواب پر اس کا ہم پہلو رہا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔

روز روز از آفتابِ روئے او می سوختم
گشت جاں آسودہ، چوں در سایۂ گیسو شدم

اس کے چہرے کے سورج سے میں روز ہی روز رہ کر جلتا رہا۔ جب اس کی زلفوں کے سائے میں آیا تب چین ملا۔

شکر ایزد را کہ گشتم جمع و رفت از من فراق
رفت جاں یکسو، و دل یکسو، و من یکسو شدم

خدا کا شکر کہ جدائی گئی اور مجھے اطمینان قلب نصیب ہوا، دل و جان جاتے رہے، تب جا کر یکسوئی ملی۔

خوش آں زماں کہ بسویش نہفتہ می نگرم
چو سوئے من نگرد پس نظر بگردانم

کیا خوب ہے وہ لمحہ جب میں نظر چرا کے اسے دیکھتا ہوں مگر جب وہ آنکھ اٹھاتا ہے تو نظر کو گھما لیتا ہوں کہ سامنا نہ ہو

کمر چہ بندی تو بگزار تا بگردِ میانت
دو دستِ خویش بجائے کمر بگردانم

کمر میں پٹکا مت باندھ، رہنے دے، تا کہ میں اس کی جگہ پر اپنے ہاتھ تیری کمر میں لپیٹ دوں

ز رشک سوختہ شد خسرو ار بود دستم
ز زلفِ تو رہِ بادِ سحر بگردانم

رشک کے مارے خسرو جل رہا ہے۔ کاش مجھے ذرا بھی اختیار ہوتا تو میں تیری زلف (کی سیاہی) سے کام لے کر نسیم صبح کو گم کردہ راہ بنا دیتا (جو تیری زلفوں سے کھیل رہی ہے)

کتابِ فقہ ندانند در مدارسِ ما
دریغ عمر کہ شد صرف در اصول و فروع

افسوس کہ ہمارے مدارس میں اصول و فروع میں عمر گزار دی جاتی ہے مگر دین کی کتاب سمجھنے کی قابلیت نہیں آتی۔

اگرچہ خسروِ روئے زمیں شدم بہ سخن
ہم از وفا سوئے تو روئے بر زمیں دارم

اگرچہ روئے زمین پر شعر و سخن کی شاہی مجھے حاصل ہو چکی ہے تاہم جہاں تک تجھ سے وفا کا تعلق ہے زمیں بوس رہتا ہوں۔

با کہ گویم غم تو کز غم تو
ہمہ عالم خراب می بینم

میں تیرے غم کی کہانی سناؤں کسے؟ کہ اس غم سے تو میں تمام عالم کو تہ و بالا دیکھ رہا ہوں۔

محقق است کہ خیاطِ غیب روزِ اوّل
نہ دوخت خلعتِ رندی بہ قدِ بوالہوساں

رندی، وہ شاہی لباس ہے کہ ازل کے دن مالکِ تقدیر نے بوالہوس کے ناپ پر اسے بیونتا ہی نہیں اور یہ بات تحقیق سے کہتا ہوں۔

اے حسنِ تو آفتِ زمانہ
روئے تو بہ دلبری فسانہ

تو وہ ہے کہ تیرا حسن آفتِ زمانہ ہے اور تیرا چہرہ دلبری کا افسانہ۔

متاعِ جاں کہ بہ ہر دو جہانش نفروشم
اگر تو می طلبی راضی اَم بیک نظرے

میری جانِ عزیز جو میں دونوں جہان کے بدلے بھی نہ دوں، لیکن اگر تو، مانگے تو تیری ایک نظر کے بدلے میں یہ سودا مجھے قبول ہے۔

سلام و خدمتِ ما اے صبا بہ یار بگوئی
فغان و زاریٔ بلبل بہ نوبہار بگوئی

اے صبا! یار سے میرا سلام و بندگی عرض کرنا اور نوبہار کو بتا دینا کہ بلبل نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔

ہزار جور کشیدم زغم کہ نتواں گفت
یکے اگر بتوانی ازاں ہزار بگوئی

غم کے ہاتھوں ہزاروں ایسے ستم سہہ چکا ہوں کہ بیان سے باہر اگر ہو سکے تو ہزار میں کم از کم ایک ضرور سنا دینا۔

خسرو بیک نظارہ رویش ز دست رفت
ویں دیدہ را ہنوز تمنائے دیگر است

ایک ہی نظارے میں خسرو قابو سے باہر ہو گیا لیکن ذرا ان آنکھوں کو دیکھو کہ پھر سے دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں۔

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد؟

تو نے رات کس کے پہلو میں (جاگ کر) گزاری کہ اب تک تیری چشمِ مست میں لال ڈورے (خمار کا اثر) موجود ہیں؟

تن پیر گشت و آرزوئے دل جواں ہنوز
دل خوں شد و حدیثِ بتاں بر زباں ہنوز

میرا جسم تو مرجھا گیا مگر دل؟ وہ اب بھی جوان ہے۔ یہ دل خون ہو چکا ہے مگر زبان پر؟ اب بھی حسینوں کی باتیں ہیں۔

هر دو عالم قیمت خود گفته ای
نرخ بالا کن که ارزانی هنوز

تونے اپنی قیمت دونوں عالم ٹھہرائی ہے داو بس؛
ارے یہ تو بہت سستا سودا ہے کچھ بھاؤ اور بڑھا

در چار حدِ کوئے خود افتاده بینی بنده را
تن یکطرف، سر یکطرف، پا یکطرف

میرے مرنے کے بعد بھی تو مجھے اپنی گلی کے چاروں طرف پڑا پائے گا۔ یوں کہ ایک طرف جسم، دوسری جانب جان، سر اور پاؤں اِدھر اُدھر۔

جان خسرو دل خسته را خوں ریختہ فرموده است
خلقی بہ منت یکطرف آں شوخ تنہا یکطرف

محبوب نے فرمادیا ہے کہ دل شکستہ خسرو کا خون بہایا جائیگا۔ تمام اہلِ عالم کے جملہ احسانات و عنایت ایک پلڑے میں اور اس شوخ کی اتنی سی بات دوسرے پلڑے میں (اور یہ پلہ بھاری ہے)

جانِ من از آرام شد آرامِ جانِ من کجا
بجرم نشان فتنہ شد، فتنہ نشانِ من کجا

میری روح کی راحت جاتی رہی، وہ میرا دلآرام کہاں ہے؟ میرا بجز فتنہ کا نشان بن گیا۔ اس فتنہ گر کو کیا ہوا؟

یک قدم بر جان خود نه یکقدم در کوئے دوست
زیں نکوتر رہروانِ عشق را رفتار نیست

رہروانِ عشق کے لئے اس سے بہتر کوئی رفتار نہیں کہ وہ ایک قدم کوئے جاناں میں رکھیں اور دوسرا اپنی جان پر۔

ما و عشقِ یار اگر در قبلہ گر در بت کده
عاشقانِ دوست را با کفر و ایمان کار نیست

قبلہ ہو کہ بت کدہ، ہر جگہ عشقِ یار میرے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے عاشقوں کو کفر و ایمان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

عاشقی ام کہ گر آواز دہی جانِ مرا
دوست از سینہ ام آواز بر آرد کہ منم

میں وہ عاشق صادق ہوں کہ اگر تم میری جان (نفس) کو پکاروگے تو اندر سے دوست کی آواز لبیک کہے گی

کج کلہا! ستمگرا! تنگ قبائی کیستی؟
لابہ گرا و دلبرا، عشوہ نمائی کیستی؟

اے کج کلاہ ستمگر، تو کس کا تنگ قبا (چہیتا) ہے؟ لگاوٹ کی باتیں کرنے والے دلبر، اپنی اداؤں سے کسے لبھا رہا ہے؟

بیا و بند قبا باز کن دمے بہ نشین
کہ عشق بر دلِ من چو قبائے تو تنگ است

آؤ دم بھر کے لیے بند قبا کھول کے بیٹھ جاؤ کہ جس طرح تمہارے بدن پر یہ قبا تنگ ہے یونہی میرے دل پر قبائے عشق چست ہے۔

بہ کوئے عاشقی از عافیت نشاں نہ دہند
ہر آں کسے کہ باو ایں دہند آن نہ دہند

کوچۂ عشق میں آرام و عافیت کی سوغات نہیں ملتی جس کسی کو یہ دیتے ہیں اُسے وہ (عافیت) نہیں دیتے۔

شب ہجراں دراز است ارچہ خسرو
مشو غمگیں کہ امید سحر است

خسرو اگرچہ ہجر کی رات لمبی ہے مگر غمگین نہ ہو اس کے بعد صبح آنے والی ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری (ظلِ حسن) ۶ فروری ۱۹۲۵ء کو سہارنپور (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اُردو کی تکمیل کے ساتھ انگریزی کے امتحانات بھی دیے۔ میرٹھ، الہ آباد، بمبئی اور ماسکو میں فلسفے اور ادبیات کی تعلیم پائی۔ ماسکو سے ۱۹۶۸ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔

انھوں نے تیرہ (۱۳) اخباروں اور رسالوں کے اڈی ٹوریل کے اسٹاف میں کام کیا اور چار کے اڈیٹر رہے۔ بمبئی میں مستقل سکونت ہے۔ گیارہ سال روس میں رہے۔ ۳۸ علمی اور ادبی کتابوں کے ترجمے کیے یا ترجموں کو اڈٹ کیا۔

امیر خسرو کے زمانے اور کارناموں پر دو (ایک انگریزی اور ایک اُردو) کتابیں مرتب کی ہیں۔ ہاؤس آف انسائکلوپیڈیا ماسکو سے پچاس ہزار الفاظ کے دو لغات اردو اور فارسی مرتب کر کے شائع کرائے۔

ظ۔ صاحب نے اقبالؔ اور غالبؔ پر وقیع کام کیا ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ امیر خسرو پر ڈھائی گھنٹے کے دو AUDIO CASSETTE ہیں جن میں پانچ ملکوں کی موسیقی اور اساتذہ کی آواز میں کلام خسرو اور حیات خسرو کو اسکے تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

"خسرو کا ذہنی سفر" انجمن ترقی اُردو نے پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع کی تھی، یہ کتاب کئی سال سے نایاب تھی۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر انجمن دوسرا اڈیشن شائع کر رہی ہے۔